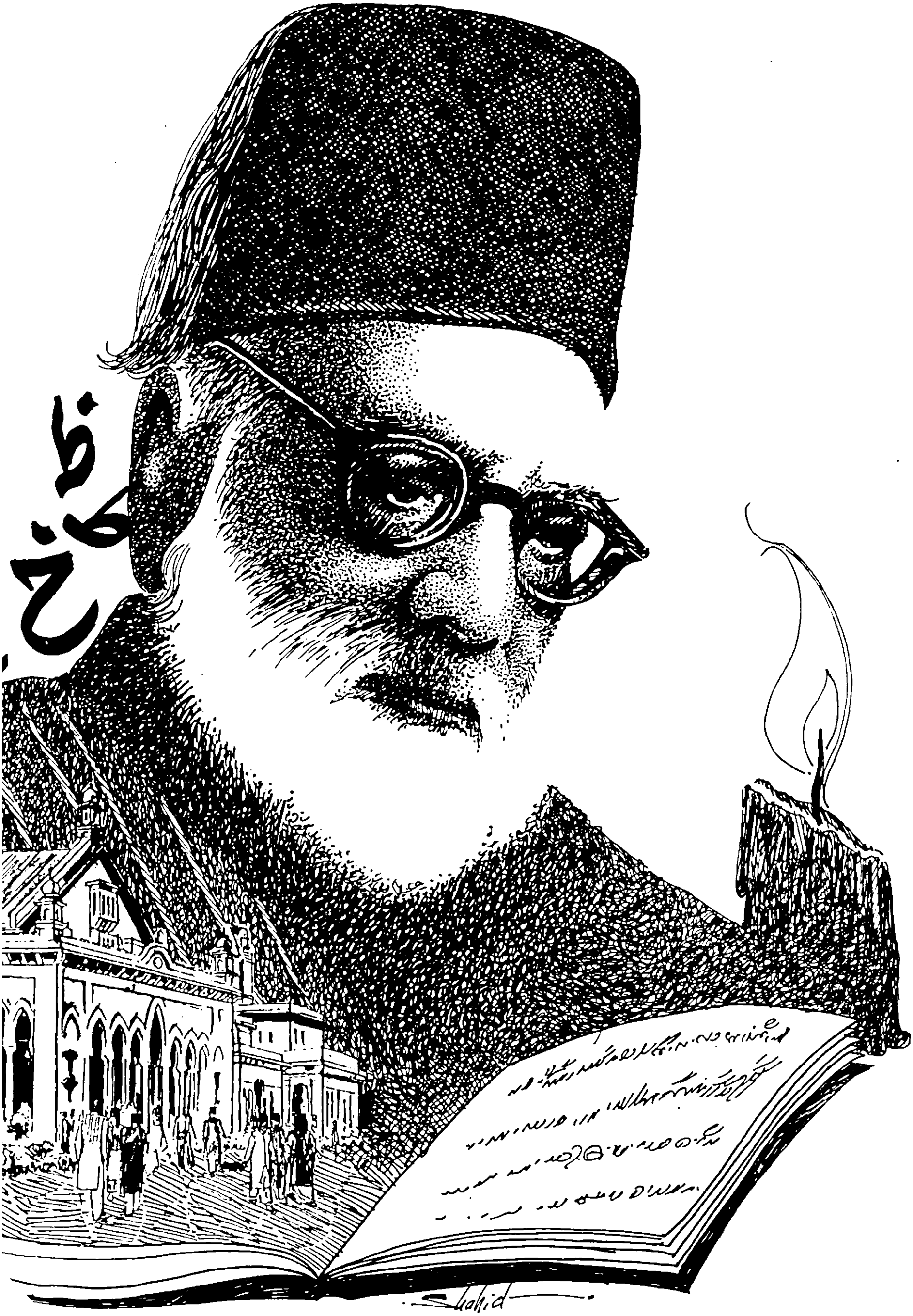
Shahid

بابائے اردو

تحریر و تحقیق: ڈاکٹر ساجد امجد

یہ ممکن نہیں کہ اردو زبان کی ترویج و ترقی کی بات ہو اور مولوی عبدالحق کا نام درمیان میں نہ آئے۔ کیونکہ تن تنہا اس راستے میں جتنا طویل اور کٹھن سفر انہوں نے طے کیا، وہ کسی اور کے بس کی بات نظر نہیں آتی۔ مولوی صاحب اردو زبان کے ان چاہنے والوں میں سے تھے جنہوں نے اپنا اوڑھنا بچھونا ہی اردو کی ترقی کو بنا لیا تھا۔ ساری زندگی اس کے سوا اور کوئی کام نہ کیا۔ بقول مولانا غلام رسول مہر "مولوی عبدالحق کے کارنامے اس درجہ بلند، گراں مایہ اور پائیدار ہیں کہ آج پاک و ہند کے آسمان کے نیچے کوئی دوسرا شخص علم و ادب اور زبان کے بارے میں ان کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتا" یہی امتیازی خصوصیات انہیں "بابائے اردو" کا خطاب دلا گئیں۔

محسنِ اردو، عاشقِ اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق کی سرگزشت

اٹکن بٹکن ڈھائی چکوتا
اگلے پھولے، بگلے پھولے
پھول پھول کی باڑیاں
راجا گیا دلی۔ وہاں سے لایا سات کٹوری
ایک کٹوری ٹوٹ گئی
راجا کی ماں روٹھ گئی۔

بچوں نے اس کے آنگن کے چاروں کونے اپنی آوازوں کے شور سے آباد کیے ہوئے تھے لیکن وہ خود اپنی ماں کے پہلو سے لگا بیٹھا تھا۔

"بیٹا، جاؤ تم بھی کھیل لو۔ دیکھو، سب بچے کھیل رہے ہیں" اس کی ماں کے پاس آئی ہوئی محلے کی ایک عورت نے کہا۔

اس تقاضے کا اثر یہ ہوا کہ ابھی تک تو وہ صرف بیٹھا ہوا تھا، اب اس نے ماں کے دوپٹے کو بھی زور سے پکڑ لیا کہ کہیں یہ خاتون اسے زبردستی یہاں سے نہ اٹھا دیں۔

"نہیں بھئی، عبدی کو کچھ نہ کہو۔ اس کا دل کسی کھیل میں نہیں لگتا۔" اس کی ماں نے کہا۔

"بہن، لڑکا ذات ہے۔ کھیلنے کودنے سے ہاتھ پاؤں سیدھے ہوتے ہیں۔ کوئی لڑکی ہے جو تمہارے کولھے سے لگی بیٹھی رہے گی۔"

"کیا کروں بہن! اپنا اپنا مزاج ہوتا ہے۔ اس کا دل نہیں لگتا کسی کھیل میں۔ مجھے تو حیرت ہے یہ مکتب کیسے چلا جاتا ہے۔"

"اسے پڑھنے میں کیسا ہے؟"

"میں کیا جانوں مگر اتنا ہے کہ مکتب پابندی سے جاتا ہے۔ گھر میں بھی کچھ نہ کچھ پڑھتا ہی رہتا ہے۔"

"چلو، اس طرف سے تو کان ٹھنڈے ہیں۔ ہمارا والا تو پڑھنے کا چور ہے۔"

"نہیں بہن! میرا عبدی پڑھنے میں بڑا تیز ہے۔"

"مری چکی میں کالا کالا دانا
چکی گھمر گھمر۔
چکی گھمر گھمر۔"

بچوں کی آوازیں بڑھتی ہی جا رہی تھیں لیکن وہ اب بھی ہر شور سے بے نیاز کسی سوچ میں گم تھا۔

گلیوں میں کھیلنا معیوب سمجھا جاتا تھا اور خصوصاً چراغ جلنے کے بعد اس لیے بچے گھروں میں کھیلتے تھے۔ کبھی ایک گھر میں چوکڑی جمتی کبھی دوسرے گھر میں۔ عبدالحق کی ماں ذرا نرم طبیعت کی تھیں اس لیے بچے اکثر یہیں آکر شور مچاتے

تھے۔

اس کی ماں کو کتنا ارمان ہوتا تھا کہ وہ اپنے عبدی کو کھیلتے ہوئے دیکھے لیکن اسے کھیلوں سے کوئی رغبت ہی نہیں تھی۔

شروع شروع میں بچوں نے اسے بہت تنگ کیا۔ اسے لڑکی ہونے کے طعنے دیے لیکن اسے ان کھیلنے والوں سے کوئی واسطہ ہی نہیں تھا۔ والدین اپنے بچوں کو کھیلنے سے روکتے ہیں۔ اس کے ساتھ معاملہ اس کے برعکس تھا پھر آہستہ آہستہ وہ بھی چپ ہوگئے۔ وہ ماں کے آنچل میں چھپ کر بڑا ہونے لگا۔

اس کا نام اس کے باپ نے عبدالحق رکھا تھا لیکن وہ اپنے بھولپن کی وجہ سے عبدی بن کر رہ گیا تھا۔

○☆○

شیخ علی حسین سرکاری ملازم تھے اور میرٹھ کے قریب ہاپوڑ میں مقیم تھے۔ عبدالحق کی پیدائش بھی یہیں ہوئی تھی۔ اس خاندان میں تمام بچوں کے نام "حسن" پر رکھے جاتے تھے لیکن شیخ علی حسین کے پیرومرشد نے انہیں ہدایت کی تھی اپنے بچوں کے نام "حق" پر رکھیں چنانچہ انہوں نے بڑے بیٹے کا نام ضیاءالحق رکھا اور دوسرے بیٹے کا نام عبدالحق۔

سرکاری ملازمت کی وجہ سے شیخ علی حسین کے تبادلے ہوتے رہتے تھے۔ جب ان کا تبادلہ پنجاب ہوا تو انہوں نے یہی مناسب سمجھا کہ وہ اکیلے نہ جائیں بلکہ بیوی بچوں کو بھی اپنے ساتھ ہی لے جائیں۔

"اس کا ذہن اچھا ہے۔ پنجاب میں تعلیمی ماحول ملے گا اور پھر میری نگرانی بھی رہے گی" شیخ علی حسین نے کہا۔

"سوچ لیں۔ آپ وہاں رہ بھی سکیں گے۔ میں تو کہتی ہوں یہ تبادلہ منسوخ کرالیں۔" ان کی بیوی نے کہا۔

"میں نے کوشش کی تھی لیکن عبدی کی ماں تم تو جانتی ہو نوکری آخر نوکری ہوتی ہے۔ مجھے جانا پڑے گا اور اتنی دور میں تم لوگوں کو چھوڑ کر نہیں جاسکتا۔"

سب تیاری مکمل ہوگئی اور عبدالحق کو والدین کے ساتھ فیروزپور آنا پڑا۔ اس کے بعد گوجرانوالہ تبادلہ ہوگیا جہاں اس نے مشن ہائی اسکول میں داخلہ لے لیا۔

اب اس کی عمر ایسی نہیں رہی تھی کہ گھر میں بند ہوکر رہے یا ماں کا آنچل تھام کر چلتا رہے۔ کم از کم اس کے والد یہ ضرور چاہتے تھے کہ وہ گھر سے باہر نکلے۔ اس کے لیے انہوں نے یہ ترکیب نکالی کہ اسے ساتھ لے کر اپنے دوستوں کے پاس جانے لگے تاکہ اس کا حجاب دور ہو اور اسے لوگوں میں اٹھنے بیٹھنے کا سلیقہ آجائے۔ عبدالحق کو بھی یہ تفریح اچھی لگی۔ نئے نئے لوگوں سے سابقہ پڑنے لگا اور پھر ہر جگہ اس کی خاطر مدارات بھی ہوتی تھی۔

ایک روز وہ کسی وکیل صاحب کے دیوان خانے میں بیٹھا ہوا تھا۔ سیاست پر گفتگو ہو رہی تھی۔ کچھ دیر کی گرما گرمی کے بعد اس بحث نے ایک نیا رخ اختیار کرلیا۔ اب جو باتیں ہو رہی تھیں' وہ اس کے لیے بڑی دلچسپ تھیں۔

"جناب' وہ اب مسلمان کہاں ہے۔ وہ تو نیچری ہیں نیچری۔"

"یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ وہ مسلمان نہیں رہے۔"

"گردن مروڑی مرغی کھاتے ہیں اور انگریزوں کے برتن میں کھاتے ہیں۔ کیا اب بھی آپ انہیں مسلمان کہیں گے۔"

"انہوں نے رسالہ لکھ کر ثابت کردیا ہے کہ انگریزوں کے ساتھ کھایا جاسکتا ہے۔"

"ان کے لکھنے سے کیا ہوتا ہے۔ ان کے کفر کے فتوے تو عرب شریف کے علما تک نے دے دیے۔ اب کیا گنجائش رہتی ہے۔"

"کچھ بھی ہو' چاہے وہ خود مسلمان نہ ہوں لیکن ان کے دل میں مسلمانوں کے لیے درد بہت ہے۔ علی گڑھ میں مدرسہ اور کالج کھولا ہے تاکہ مسلمان بچے انگریزی تعلیم حاصل کریں۔"

"یہی تو خرابی کی سب سے بڑی جڑ ہے۔ اب مسلمان بچوں کو انگریز بنایا جائے گا۔ ان کے دین میں خرابی پیدا کی جائے گی۔ غضب خدا کا! اب مسلمان بچے کوٹ پتلون پہننے لگے۔"

"کمال کرتے ہیں آپ۔ وہ مسلمانوں کی ترقی کے لیے دن رات ایک کررہا ہے اور آپ ہیں کہ اسے مسلمان ماننے کو تیار نہیں۔"

"کیسے مان لوں۔ وہ حج کرنے نہیں گئے' انگلستان چلے گئے۔ یہ ہے ان کا اسلام۔"

"وہ اگر انگلستان گئے تو وہ بھی مسلمانوں کے لیے گئے۔"

"آپ پر تو سرسید کا بھوت سوار ہے۔ آپ تو یہی کہیں گے۔"

"اس کا لوہا تو انگریز بھی مانتے ہیں۔ سنا ہے ان کے مرنے کے بعد ان کا سر انگریز لے جائیں گے کہ بھئی' اس سے عقل مند آدمی ہم نے نہیں دیکھا۔"

"مرنے کا انتظار کیوں کر رہے ہیں۔ ابھی لے جائیں۔ ہماری جان تو چھوٹے۔"

یہ بحث کبھی ختم ہونے والی نہیں تھی اس لیے جب تلخی بہت بڑھنے لگی تو صاحبِ خانہ نے مداخلت کرکے اس گفتگو کو روک دیا۔

یہ پہلا موقع تھا جب عبدالحق نے سرسید احمد خان کا نام سنا تھا۔ وہ ان کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا تھا لیکن جو گفتگو اس نے سنی تھی، اس کے بعد اسے ان کی شخصیت میں دلچسپی ہوگئی تھی۔ وہ سوچنے لگا تھا کہ وہ ضرور کوئی عظیم شخصیت ہوگی اسی لیے اتنے لوگ اس کے خلاف ہیں۔

اس وقت ہندوستان کی قومی زندگی اس بیمار کی طرح آنکھیں جھپک رہی تھی جو موت کے منہ سے نکل آیا ہو لیکن اس نئی زندگی کو اپنے مسیحاؤں کا کمال سمجھنے کے بجائے تقدیر کا تماشا سمجھ رہا ہو۔ جنگِ آزادی کی شکست کے زخم ابھی مندمل نہیں ہوئے تھے۔ کہنے کو دو دہائیاں گزر گئی تھیں لیکن زخم اتنے گہرے تھے کہ بھرنے ہی میں نہیں آتے تھے۔ ہر وہ شخص جو انگریزوں کا دوست تھا انہیں اپنا دشمن نظر آتا تھا۔ سرسید کی انگریز دوستی نے سب کو ان کا دشمن بنادیا تھا۔ مسلمانوں کے ہر طبقے میں سرسید کا نام موضوعِ بحث بنا ہوا تھا۔ ان کی نسبت کفر والحاد کے فتوے عام تھے۔

ایک مرتبہ اس نے سرسید کا نام سن لیا تو بار بار یہ نام سامنے آنے لگا۔ کہیں تعریفوں کی صورت میں، کہیں برائی کی شکل میں۔ وہ اس نام کو جتنا جتنا سنتا جاتا تھا، اتنی ہی عقیدت بڑھتی جاتی تھی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ خود اس کے والد سرسید کے حق میں تھے، خلاف نہیں تھے۔ خاص طور پر سرسید کی تعلیمی خدمات کے وہ بہت معترف تھے۔

وہ دن اس کی زندگی میں ایک نیا سورج طلوع کرنے آیا تھا جب وہ اپنے ایک ہم جماعت کے گھر گیا۔

"تم بہت پڑھاکو ہونا۔ آؤ تمہیں ایک چیز دکھاؤں" اس کے دوست نے کہا اور اسے اپنے ساتھ ایک کمرے میں لے گیا "یہ میرے والد کا کتب خانہ ہے۔ دیکھو، کتنی کتابیں ہیں یہاں۔"

عبدالحق کی آنکھیں فرطِ مسرت سے چمکنے لگیں۔ اتنی کتابیں ایک جگہ رکھی ہوئی اس نے کبھی نہیں دیکھی تھیں۔ اس کا جی چاہا کہ یہ سب کتابیں اٹھا کر وہ اپنے گھر لے جائے۔ اتنی کتابیں پڑھنے کے بعد وہ کتنا بڑا آدمی بن جائے گا۔

حیرت کے حصار سے باہر آیا تو اس نے ان کتابوں کو الٹ پلٹ کر دیکھنا شروع کیا۔ ایک الماری میں کچھ رسائل رکھے تھے جن پر بنے ہوئے بیل بوٹوں نے اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر ایک رسالہ اٹھالیا۔ بیل بوٹوں کے درمیان جب اس کی نظر تحریر پر پڑی تو وہ چونک اٹھا۔ جلی حروف میں لکھا ہوا تھا "تہذیب الاخلاق۔"

"یہ تو سرسید احمد خان کا رسالہ ہے جو وہ علی گڑھ سے نکالتے ہیں" عبدالحق نے اپنے دوست سے کہا۔

"ہوگا۔ مجھے کیا، یہ سب تو ابا کے ہیں۔"

"کمال ہے۔ تمہارے گھر میں ہیں اور تم انہیں پڑھتے نہیں۔ تم نے تو سرسید کا نام بھی نہیں سنا ہوگا۔"

"نام تو سنا ہے۔"

"میں نے بھی بس نام ہی سنا ہے۔ کبھی انہیں دیکھا نہیں" عبدالحق نے بڑی ندامت کے ساتھ کہا اور ساتھ ہی ساتھ رسالے کے اوراق بھی پلٹتا رہا۔ "یار، یہ ایک رسالہ میں لے جاؤں؟"

"نہ بابا نہ۔ ابا تو میری کھال کھینچ لیں گے۔"

"میں پڑھ کر واپس کردوں گا۔ پھر تم اسے یہیں رکھ دینا۔"

وہ لڑکا کچھ دیر کے لیے سوچ میں پڑ گیا پھر اسے عبدالحق

"سوانحی خاکہ"

نام	عبدالحق
والد	شیخ علی حسین
بھائی	شیخ ضیاء الحق، شیخ احمد حسن
مولد	ہاپوڑ، ضلع میرٹھ
تعلیم	علی گڑھ (بی اے) ۱۸۹۴ء
اعزازی ڈگری	ڈی لٹ الٰہ آباد یونیورسٹی
	ڈی لٹ، علی گڑھ یونیورسٹی
ملازمتیں	ہیڈ ماسٹر، مدرسہ آصفیہ
	ہوم سیکریٹریٹ میں مترجم
	مددگار، ڈائریکٹر تعلیم
	ڈائریکٹر سررشتہ تالیف و ترجمہ
	پرنسپل عثمانیہ کالج، اورنگ آباد
	صدر شعبہ اردو، جامعہ عثمانیہ
	سیکریٹری انجمن ترقی اردو ۱۹۱۲ء تا ۱۹۴۹ء
	صدر انجمن ترقی اردو ۱۹۵۰ء تا ۱۹۶۱ء
پیدائش	۲۰ اگست ۱۸۷۰ء
وفات	۱۶ اگست ۱۹۶۱ء۔ کراچی

کی معصوم صورت پر رحم آگیا۔
"واپس کردو گے نا؟"
"ہاں بھئی۔ واپس نہیں کروں گا تو دوسرا رسالہ کیسے ملے گا۔"
اس لڑکے نے اِدھراُدھر دیکھا اور ایک ساتھ دو رسالے چپکے سے اس کے حوالے کردیے "اس میں کیا لکھا ہے' ذرا مجھے بھی بتانا۔"
اب وہ وہاں نہیں رک سکتا تھا۔ اس نے رسالے بغل میں دبائے اور اس خزانے کو لے کر گھر پہنچ گیا۔ اس کے لیے یہ خزانہ ہی تو تھا۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ جس شخص کے لوگ اتنے خلاف ہیں' وہ اپنی تحریروں میں کیا لکھتا ہے۔
پہلے ہی رسالے میں سرسید کے دو مضامین شامل تھے۔ اس کی تو دونوں مٹھیاں چاندی کے روپوں سے بھر گئیں۔ اس نے جلدی جلدی دونوں مضامین پڑھ ڈالے۔ یہ دنیا ہی اور تھی۔ یہ جہان ہی دوسرا تھا۔ جو کچھ کہنے والے کے دل میں تھا' وہ اب اس کے دل میں اُتر رہا تھا۔ اس نے اب تک جو دو چار کتابیں پڑھی تھیں' ان مضامین کی زبان ان سے بالکل مختلف تھی۔ سادہ اور عام فہم الفاظ تھے۔ طرزِ ادا ایسی کہ پڑھتے رہیئے اور جی نہ بھرے۔ لفظوں کے طوطا مینا نہیں بنائے گئے تھے۔ سارا زورِ اظہار مطلب پر تھا۔ کہیں کہیں شوخی اور ظرافت بھی اپنے پَر پھیلائے بیٹھی تھی۔ خیالی جادوگری نہیں' حقیقت کا طلسم تھا جس کے حصار میں اس مضمون کا ایک ایک لفظ تھا۔ عقلی دلائل سے ایک ایک بات کو سمجھایا گیا تھا۔
اس مضمون کو ختم کرنے کے بعد وہ کچھ دیر تک گہرے گہرے سانس لیتا رہا۔ آنکھیں کھولیں تو یوں لگتا تھا جیسے اندھیرے سے روشنی میں آگیا ہو۔ اچھا تو اس لیے لوگ ان کی برائی کرتے ہیں۔ نئی باتیں بڑی دیر میں حلق سے نیچے اترتی ہیں۔ یہ بڑی عمر کے لوگ ان نئی باتوں کو کہاں قبول کرنے والے۔
اس کے بعد اس نے ایک مضمون مولوی چراغ علی کا پڑھا۔ یہ مذہبی نوعیت کا مضمون تھا۔ زبان قدرے مشکل تھی لیکن پھر بھی اس نے جیسے تیسے اس مضمون کو ختم کر ہی لیا۔
اس دن کے بعد سے اسے چسکا سا پڑگیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے جتنے پرچے' اسے ملے اس نے پڑھ ڈالے۔ اس پر حیرت کے دروازے کھلتے جارہے تھے۔ یہ کیسا آدمی ہے جو کبھی تاریخ پر لکھتا ہے کبھی مذہب پر۔ کبھی ادب پر کبھی سماجی مسئلے پر قلم اٹھاتا ہے اور ہر جگہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ معلومات کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ سب سے زیادہ جس بات نے اسے متاثر کیا' وہ ان مضامین کا تحقیقی مواد تھا۔ وہ اس بات کا قائل ہوگیا کہ سرسید کوئی بات تحقیق کیے بغیر نہیں لکھتے۔ اسے یقین آگیا کہ تحقیق' تلاش اور جستجو کے بعد ہی وہ اعتماد پیدا ہوتا ہے جو لکھنے والے کے قلم میں طاقت پیدا کردیتا ہے۔ کسی چھپی ہوئی بات کو ظاہر کرنے ہی میں نیاپن ہے اور یہ تحقیق کے بغیر نہیں ہوسکتا۔
ان رسالوں کو پڑھ پڑھ کر اسے بھی شوق ہونے لگا تھا کہ وہ بھی کچھ لکھے۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ جب بھی کچھ لکھے گا پوری تحقیق اور چھان بین کے بعد لکھے گا جس طرح سرسید اور ان کے ساتھی لکھتے ہیں۔
ان پرچوں کے ذریعے اسے یہ بھی معلوم ہوگیا تھا کہ علی گڑھ میں سرسید نے ایک اسکول اور کالج قائم کیا ہے۔ اس کا بہت جی چاہتا تھا کہ وہ سرسید کے اسکول میں تعلیم حاصل کرے لیکن باپ سے کہنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ اسے تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ علی گڑھ ہے کہاں۔ اگر دور ہے تو وہ وہاں کس طرح جاسکے گا۔
اس نے گوجرانوالہ مشن اسکول سے مڈل کا امتحان پاس کیا تھا کہ شیخ علی حسین کا تبادلہ دوبارہ ہاپوڑ ہوگیا۔ اب انہیں عبدالحق کی تعلیم کی فکر ہوئی۔ ان کی اس پریشانی کو خود عبدالحق نے دور کردیا۔
"آپ مجھے علی گڑھ کے مدرسے میں داخل کرادیجئے۔ کالج بھی وہیں ہے۔ اسکول سے نکل کر کالج میں پہنچ جاؤں گا۔ آج کل سب لوگ وہیں پڑھنے جارہے ہیں۔ سنا ہے وہاں کے طالب علم کو نوکری بھی آسانی سے مل جاتی ہے۔"
اس نے ایک لمبی چوڑی تقریر کرڈالی تاکہ والد پر زیادہ سے زیادہ اثر ہو اور وہ داخلے کے لیے رضامند ہوجائیں۔
"تم نے وہاں کے متعلق اتنی معلومات کہاں سے جمع کرلیں" والد نے پوچھا۔
"میں نے تہذیب الاخلاق کے کچھ پرچے پڑھے تھے۔ یہ معلومات وہیں سے حاصل کی ہیں۔"
"کہہ تو تم ٹھیک رہے ہو۔ نئے زمانے کی تعلیم تمہیں وہیں سے مل سکتی ہے لیکن علی گڑھ دور بہت ہے۔ تمہیں گھر سے دور' بورڈنگ میں رہنا ہوگا۔ بس چھٹیوں میں گھر آیا کروگے۔"
"کیا مضائقہ ہے۔ آدمی تو کام کا بن جاؤں گا۔"
"ہاں' یہ تو ہے۔ دیکھو' میں چند دوستوں سے مشورہ کرکے کوئی فیصلہ کرتا ہوں۔"

عبدالحق دل ہی دل میں ڈر رہا تھا کہ کہیں ابا کے دوست انہیں بہکا نہ دیں۔

شیخ علی حسین فیصلہ کر چکے تھے۔ چند دوستوں نے مخالفت بھی کی لیکن وہ عبدالحق کو لے کر علی گڑھ پہنچ گئے۔ داخلہ بھی ہوگیا اور انگریز ہیڈ ماسٹر مسٹر ہورسٹ کی عنایت سے بورڈنگ ہاؤس میں کمرا بھی مل گیا۔

شیخ علی حسین اسے وہاں چھوڑ کر ہاپوڑ واپس آگئے اور وہ اس طلسم خانے میں گم ہو کر رہ گیا۔ اسے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ کسی نئی دنیا میں آگیا ہو۔ یہاں کے طالب علم ان کی عادات اور شرارتیں اور مصروفیات۔ اساتذہ، ڈائننگ ہال اور اس کے کھانے۔ اس کے لیے یہ سب کچھ ایک حسین خواب کی طرح تھا۔ سب سے خاص بات جو اسے یہاں نظر آئی، قومیت کا احساس تھا۔ یہاں ہندوستان کے ہر علاقے اور ہر صوبے کے طالب علم تھے۔ سب اردو بولتے تھے اور خوب بے تکلف بولتے تھے۔ کسی کو یہ خیال تک نہیں تھا کہ وہ کس علاقے اور کس صوبے کا ہے۔ ہندو ہے یا مسلمان۔ سب بھائیوں کی طرح تھے۔

استادوں کا رویہ ہر طالب علم کے ساتھ ایسا برادرانہ اور مشفقانہ تھا کہ کمزور سے کمزور طالب علم میں پڑھنے کا حوصلہ بیدار ہو جاتا تھا۔ بس یہ معلوم ہوتا تھا جیسے ایک بڑا خاندان ہے جو ایک عمارت میں رہ رہا ہے۔

سب سے پہلے اس کا سابقہ سیکنڈ ہیڈ ماسٹر ولایت حسین سے پڑا۔ چونکہ بورڈنگ ہاؤس کی نگرانی انہی کے ذمے تھی اس لیے بورڈنگ ہاؤس میں مقیم لڑکوں کے ساتھ وہ خاص شفقت سے پیش آتے تھے۔ چند ہی دنوں میں عبدالحق کی سنجیدگی اور طالب علمانہ روش نے انہیں اچھا خاصا متاثر کردیا۔

وہ ریاضی کے استاد تھے۔ ایک دن عبدالحق کسی وجہ سے ان کا کام کر کے نہیں لایا۔ بہت خفا ہوئے۔

"میں تو تمہارا بھاٹ بنا ہوا ہوں اور جگہ جگہ تمہاری تعریف کرتا پھرتا ہوں۔ اور تم میرا ہی کام کر کے نہیں لاتے۔"

یہ سمجھانے کا ایسا طریقہ تھا کہ عبدالحق آئندہ شکایت کا موقع ہی نہ دے سکا۔ اسے یہ غیرت آتی تھی کہ وہ استاد ہو کر میری تعریف کرتے ہیں۔ میں اگر خود کو اس تعریف کا اہل ثابت نہ کرسکوں تو یہ کتنے شرم کی بات ہے۔

دوسرے معلم جن سے وہ متاثر ہوا مولوی خلیل اللہ تھے۔ وہ عربی کے استاد تھے۔ چھوٹا قد۔ ٹخنوں سے اونچا شرعی پاجامہ۔ ہر وقت کوئی نہ کوئی کتاب ہاتھ میں رہتی۔ مطالعے کے بے حد شائق۔ ان کی یہی ادا عبدالحق کے دل میں اتر گئی۔ اسے خود بھی پڑھنے کے سوا کوئی دوسرا کام نہ تھا۔ ان کی جوہر شناس آنکھوں نے بہت جلد عبدالحق کا انتخاب کرلیا۔

"تم نے فارسی کا مضمون کیوں لیا۔ عربی کیوں نہیں لی" ایک دن انہوں نے پوچھا۔ "عربی پڑھ لو۔ یہ تمہارے کام آئے گی۔"

"مڈل تک تو میں نے عربی پڑھی ہے لیکن اب فارسی لے لی۔ عربی کیسے پڑھ سکتا ہوں۔"

"پڑھ کیوں نہیں سکتے۔ میں تمہیں پڑھاؤں گا۔ تم میرے پاس آجایا کرو۔"

وہ بورڈنگ ہاؤس ہی میں رہتے تھے اس لیے ان کے پاس جانا مشکل نہیں تھا۔ ان کا کمرا پکی بارک اور کچی بارک کے درمیان تھا۔

وہ اس وقت کوئی کتاب پڑھ رہے تھے۔ کمرے کے باہر قدموں کی آہٹ سنی تو انہوں نے کتاب آنکھوں سے ہٹالی۔

"کون ہے بھائی۔ کوئی ملازم ہے تو ذرا چلم بھر کر لادو۔ طالب علم ہو تو اندر چلے آؤ۔"

عبدالحق نے جھانکنے کے انداز میں اندر دیکھا۔ ان کی

چند قابلِ ذکر تصانیف

۱۔ مرہٹی زبان پر فارسی کا اثر
۲۔ مرحوم دلی کالج
۳۔ سرسید احمد خاں حالات و افکار
۴۔ چند ہم عصر
۵۔ اردو کی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا حصہ
۶۔ نصرتی
۷۔ مقدماتِ عبدالحق۔
۸۔ پاکستان میں اردو کا المیہ
۹۔ تنقیداتِ عبدالحق۔
۱۰۔ خطباتِ عبدالحق۔

○☆○

نظر کچھ کمزور تھی اس لیے پہچان نہیں پا رہے تھے۔

"بھئی، کیا چوروں کی طرح جھانک رہے ہو۔ کون ہو بولتے کیوں نہیں۔"

"میں ہوں عبدالحق!" اس نے کہا اور کمرے میں داخل ہو گیا۔

"ارے، یہ تو تم ہو۔ آؤ بیٹھو، ادھر آجاؤ۔" انہوں نے کتابیں سمیٹ دیں اور وہ دری پر بیٹھ گیا۔

"میاں عبدالحق، یہ لڑکے بڑے شریر ہو گئے ہیں۔ میں نے کچھ آم منگائے تھے۔ کمرے میں رکھ کر چلا گیا تھا۔ واپس آیا تو سب آم غائب ہیں۔ کم بختوں نے آم کھائے تو کھائے گٹھلیاں بھی اپنے ساتھ ہی لے گئے۔ میں نے یہ آم باغ میں بونے کے لیے منگائے تھے۔"

عبدالحق کو ہنسی تو بہت آئی لیکن ان کے سامنے ہنسنا بے ہودگی تھی اس لیے چپ بیٹھا رہا۔

"بھئی تم کیسے لڑکے ہو۔ اتنی اچھی بات سن کر بھی تمہیں ہنسی نہیں آئی۔ اتنی سی عمر میں فلسفی ہو گئے ہو یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے۔"

"آپ کا نقصان ہو گیا۔ میں ہنس کیسے سکتا ہوں۔"

"نقصان کیسا۔ لڑکوں کی شرارت تھی۔ میں تو خود بہت دیر تک ہنستا تھا۔ اس عمر میں شرارت کرتے ہوئے لڑکے مجھے بہت اچھے لگتے ہیں۔ ٹھہرو! میں تمہارے لیے کھیر لاتا ہوں۔ کل ہی گھر سے آئی ہے۔"

انہوں نے کھیر کا پیالہ اس کے سامنے رکھ دیا اور اس کی پڑھائی کے متعلق پوچھنے لگے۔

"آپ نے کہا تھا عربی پڑھوں۔ اسی کے لیے حاضر ہوا تھا۔" عبدالحق نے کہا۔

"ارے ہاں، وہ تو ہم بھول ہی گئے تھے۔ چلو الف لیلہ سے شروع کرتے ہیں۔ اس کی زبان سادہ ہے اور قصے دلچسپ ہیں۔ تمہارا خوب دل لگے گا۔"

اس دن کے بعد سے وہ ان کے پاس پڑھنے کے لیے جانے لگا۔ ان کے پڑھانے کا انداز ایسا دل نشین تھا کہ بہت جلد وہ اردو سے عربی اور عربی سے اردو میں ترجمہ کرنے لگا۔

اسکول کے بعد جب وہ کالج میں آیا تو قابلیت کے اعتبار سے عام طالب علموں سے کہیں آگے تھا۔ کالج میں پہنچتے ہی استادوں کی آنکھ کا تارا بن گیا۔

اسکول کے برعکس، کالج کے تمام اساتذہ ایک دو کو چھوڑ کر انگریز تھے لیکن سب پر مشرقی رنگ چڑھا ہوا تھا۔ پروفیسر آرنلڈ ہمیشہ عربی لباس میں آتے تھے۔ سر پر عمامہ، بدن پر عبا و قبا اور پیروں میں سلیم شاہی جوتا۔

کالج کے ہنگامے، اسکول سے بالکل مختلف تھے۔ وہ ان ہنگاموں سے بے خبر اپنی کتابوں میں گم تھا۔ کالج یونین کے جلسے اور ہنگامے طلبہ کی توجہ کو تقسیم کرنے کے نہایت دل نشین ہتھیار تھے۔ بڑے بڑے پڑھاکو لڑکے ان جلسوں میں شریک ہوتے تھے لیکن اسے کوئی جلسہ اپنی طرف نہ کھینچ سکا حتیٰ کہ کالج میں قائم ادبی انجمنوں سے بھی وہ دور ہی دور رہا۔ البتہ جب پروفیسر آرنلڈ نے ایک انجمن "اخوان الصفا" قائم کی تو اس نے ایک مضمون "سینٹ پال" پر پڑھا۔ یہ مضمون اتنا کامیاب ہوا کہ اس دن کے بعد سے لڑکے اسے سینٹ پال کہنے لگے۔ وہ اس خطاب کا حق دار بھی تھا۔ کالج کی ہر رنگین صحبت سے بے نیاز، ہر وقت اپنی کتابوں میں غرق۔

اس نے "اخوان الصفا" میں دو ایک مضامین اور پڑھے تو اس کے قلم کی دھاک بیٹھ گئی۔ یہ مضامین ہرگز کسی طالب علم کی کاوش معلوم نہ ہوتے تھے۔ پروفیسر آرنلڈ تو اس جوہر قابل کے پرستاروں میں شامل ہو گئے۔ اس دن تو وہ حیران رہ گیا جب وہ خود چل کر اس کے کمرے میں آئے۔

"میں شام کی سیر کے لیے جا رہا تھا۔ سوچا تمہیں بھی ساتھ لیتا چلوں۔ شام کے وقت چہل قدمی کیا کرو۔ صحت کے لیے مفید ہوتا ہے۔"

وہ جیسا بیٹھا تھا اسی طرح ان کے ساتھ ہو لیا۔ سیر کیا تھی، یہ بھی تدریس کا ایک ذریعہ تھا۔ راستے بھر علم و ادب پر باتیں ہوتی رہی تھیں۔

"آج کل کیا کر رہے ہو؟ کچھ لکھ رہے ہو؟" پروفیسر آرنلڈ نے پوچھا۔

"ان دنوں بابیوں کے مذہب پر کچھ لکھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔"

"بڑا تحقیقی مزاج پایا ہے۔ بھئی، تمہیں اس کا خیال کیسے آیا اور پھر اس پر کتابیں کہاں سے مل گئیں؟"

"کچھ مسالا اِدھر اُدھر سے جمع کیا ہے۔ کچھ چیزیں اور ملنے کی امید ہے۔ پھر لکھنا شروع کروں گا۔"

"کچھ چیزیں میرے پاس بھی ہیں۔ وہ میں تمہیں فراہم کروں گا۔"

دوسرے دن پروفیسر آرنلڈ نے رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے چند نمبر اسے بھیجے جن میں آرنلڈ نے بابی مذہب پر چند مضامین لکھے تھے۔

اس کے تحقیقی شوق نے ایسی شدت اختیار کی کہ جب کالج کا کتب خانہ کم پڑ گیا تو اس نے دوسرے کتب خانوں کا

رخ کیا۔ اس نے کہیں سے اورنگ آباد کے پن چکی والے کتب خانے کا ذکر سنا تھا۔ اسے دھن سوار ہوگئی کہ کسی نہ کسی طرح اس کتب خانے تک پہنچ جائے۔ یہ سفر آسان نہیں تھا۔ اورنگ آباد تک ریل بھی جاری نہیں ہوئی تھی۔ اس نے یہ سفر احمد نگر کے راستے سے طے کیا لیکن افسوس! اس نے کتب خانے کا ذکر تو کہیں پڑھ یا سن لیا تھا لیکن یہ خبر اس تک نہیں پہنچی تھی کہ یہ عظیم کتب خانہ کب کا لٹ چکا۔ چند دکنی مخطوطات کے سوا کچھ بھی اسے دیکھنے کو نہیں ملا۔

تحقیق کے اس شوق نے اسے اپنی عمر سے کہیں زیادہ سنجیدہ بنادیا تھا۔ علی گڑھ کالج، صرف مسلمانوں کی تعلیم ہی کا مرکز نہیں تھا، کھیلوں میں سب سے آگے تھا۔ شام کے وقت کھیل کے میدان لڑکوں سے بھرے ہوتے تھے۔ کچھ کھیلتے تھے کچھ صرف دیکھنے کے لیے آتے تھے۔ طلبہ کی حوصلہ افزائی کے لیے اساتذہ بھی یہاں جمع ہوتے تھے۔ کئی مرتبہ اس کے ساتھیوں نے اسے بھی مجبور کیا لیکن کھیلوں سے نفرت اس کے بچپن کا شوق تھا جو اَب تک قائم تھا۔ اس کی تو دنیا ہی اور تھی۔

مسٹر تھیوڈر بیک کالج کے پرنسپل کی حیثیت سے نئے نئے آئے تھے۔ نوجوان تھے اس لیے طلبہ میں جلد ہی گھل مل گئے۔ عبدالحق پر ان کی خاص نظرِ عنایت تھی لیکن وہ اس کی اس بات سے بہت نالاں تھے کہ وہ کوئی کھیل نہیں کھیلتا۔ وہ اس سے کئی مرتبہ کہہ چکے تھے کہ کوئی کھیل کھیلا کرے لیکن یہ اس کے بس کا نہیں تھا۔ بالآخر ایک دن وہ پکڑا گیا۔ مسٹر بیک خود اسے لینے اس کے کمرے میں آگئے۔

”کمال ہے! اس وقت تم اپنے کمرے میں بند بیٹھے ہو۔ چلو میرے ساتھ فیلڈ میں چلو۔“

”سر! مجھے کھیلوں سے کوئی رغبت نہیں ہے۔“

”رغبت ہوگی کیسے۔ کبھی تم وہاں گئے ہی نہیں۔ یاد رکھو، ذہنی صحت کے لیے کھیل بھی بڑے ضروری ہیں۔“

”میرے پاس اتنا وقت ہی نہیں بچتا کہ کھیل کے میدان کا رخ کروں۔“

”وقت نکالنا پڑتا ہے، چلو میرے ساتھ۔“

”اچھا سر، کل ضرور وقت نکال لوں گا۔“

”تم یہ سنہری اصول تو جانتے ہوگے کہ آج کا کام کل پر نہیں ٹالنا چاہیے۔ آج ہی چلنا ہوگا۔“

اب مزید بحث کرنا گستاخی ہوتا۔ وہ پرنسپل ہوکر اسے بلانے آئے تھے۔ اسے جانا پڑا۔ وہ گراؤنڈ میں چلا تو گیا تھا لیکن برابر اس فکر میں تھا کہ موقع ملے اور وہ یہاں سے فرار ہو۔ آخر اسے موقع مل گیا۔ مسٹر بیک کسی سے گفتگو میں مصروف ہوئے اور وہ وہاں سے کھسک لیا پھر یہ سلسلہ ہمیشہ چلتا رہا کہ مسٹر بیک اسے لے جاتے اور وہ انہیں غچا دے کر وہاں سے بھاگ کھڑا ہوتا۔

چھٹیوں کے دن آئے تو وہ بڑا پریشان ہوا کہ ہاپوڑ جاکر اتنے دن تک کیا کرے گا۔ اس پریشانی کا حل کسی نے اسے یہ بتایا کہ لائبریری سے کتابیں مستعار لے لے اور گھر بیٹھ کر پڑھے۔ یہ کام پروفیسر آرنلڈ کے سپرد تھا اس لیے اس کی ہمت ہوگئی۔ اکثر طالب علم کتابیں مستعار لے جاتے تھے۔ اس نے مطلوبہ کتابوں کی فہرست تیار کی اور پروفیسر آرنلڈ کے پاس پہنچ گیا۔

”تمہیں بڑی ہوس ہے۔ اتنی ساری کتابیں کیسے پڑھوگے؟“ انہوں نے لمبی چوڑی فہرست دیکھ کر اس سے کہا۔

انہوں نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ جب وہ واپس آیا تو بہت ساری کتابیں ایسی تھیں جو وہ پڑھ نہیں سکا تھا۔ وہ کتابیں دیکھ کر خود پر قابو رکھ ہی نہیں سکتا تھا۔ اس کا جی تو بس یہ چاہتا تھا کہ کتابوں ہی میں رہے۔ کتابوں ہی میں سوئے، کتابوں ہی میں اٹھے۔

سرسید احمد خان کو دیکھنے اور ملنے کے مواقع بھی اسے اسی کالج میں میسر آئے۔ کالج نیا نیا قائم ہوا تھا۔ بہت سے کمروں کی ابھی بنیادیں ہی پڑی تھیں۔ باغ وغیرہ لگائے جارہے تھے۔ سرسید کا معمول تھا کہ صبح کو کالج کی عمارت، باغ وغیرہ دیکھنے آتے تھے۔ وہ انہیں بڑے اشتیاق سے دیکھتا تھا اور وہ یہ دیکھ کر حیران رہ جاتا تھا کہ وہ اپنے بھاری بدن اور بڑھاپے کے باوجود پودوں کو پانی دیتے تھے۔ دھوپ میں کھڑے ہوکر مزدوروں کو ہدایات دیتے تھے۔ انہیں دیکھ کر یہ عقیدہ اس کے دل میں راسخ ہوگیا تھا کہ بڑا آدمی بننے کے لیے سخت محنت کی ضرورت ہوتی ہے۔ کام کام اور صرف کام۔ یہ ہے کامیابی کا راز۔

کانفرنس ہال میں ہونے والے جلسے بھی اس کے سمندِ شوق کے لیے تازیانے کا کام کرتے تھے۔ ان جلسوں میں مسلم اکابرین شریک ہوتے تھے جنہیں قریب سے دیکھنے اور ملنے کے مواقع اسے حاصل ہوئے۔ انہی جلسوں کے طفیل اسے سرسید کی قربت حاصل ہوئی۔ یہیں اس نے حالی کو دیکھا۔ انہی جلسوں کی بدولت وہ ہندوستان کی سیاسی حالت سے واقف ہوا۔

علی گڑھ صرف تعلیمی درس گاہ نہیں تھی، تہذیبی مرکز

بھی تھا اور تربیتی ادارہ بھی۔ وہ نہایت خاموشی سے یہاں کی ایک ایک بات اپنے لہو میں اتار رہا تھا۔

سرسید سے ابھی دور دور کی ملاقات تھی لیکن سرسید کی عقابی نگاہوں نے اس کا انتخاب کرلیا تھا۔ گرمیوں کی چھٹیاں ہوچکی تھیں۔ وہ اس مرتبہ گھر نہیں گیا تھا۔ کالج ہی میں رہ کر کتب خانے کی کتابیں چاٹ رہا تھا۔ ایک دن سرسید نے اسے حکم دیا کہ ان کے کتب خانے کی کتابیں بہت بے ترتیب رکھی ہیں، انہیں آکر کسی وقت ترتیب سے لگادو۔ ایک تو کتابیں اور وہ بھی سرسید کے کتب خانے کی۔ اس کے تو من کی مراد پوری ہوگئی۔ اس بہانے وہ سرسید کے کتب خانے کو بھی دیکھ لے گا۔ وہ اپنے لڑکپن کے اس دور کو یاد کررہا تھا جب اس نے اس عظیم ہستی کا صرف نام سنا تھا اور وہ بھی اچھے لفظوں میں نہیں۔ اس نے فوراً ایک اور لڑکے کو ساتھ لیا اور ان کے کتب خانے میں پہنچ گیا۔ اتنا وقت تو نہیں تھا کہ وہ ان کتابوں کو پڑھنے بیٹھ جاتا لیکن انہیں ترتیب سے رکھتے ہوئے وہ ایک ایک کتاب کو نظروں میں رکھتا جارہا تھا کہ کبھی ضرورت پڑی تو یہاں سے لے لے گا۔

گرمیوں کی دوپہر تھی۔ سرسید اسی کمرے میں ایک طرف تخت پر لیٹے ہوئے تھے۔ ان کی بغل میں ان کا پوتا مسعود (سرراس مسعود) لیٹا تھا۔

وہ اسے سلانے کی کوشش کررہے تھے لیکن وہ تھا کہ سونے کے لیے تیار ہی نہیں تھا۔ اتنے میں انہوں نے اپنی بھاری آواز میں اسے لوری سنانی شروع کی۔ ان کی آواز ایسی گرج دار اور بے ہنگم تھی کہ عبدالحق کو اپنی ہنسی ضبط کرنا مشکل ہوگیا۔ دونوں لڑکے دوسرے دروازے سے باہر بھاگے اور ہنسی کا خزانہ باہر جاکر لٹادیا۔ یہ محض ہنسی کی بات تھی لیکن جب عبدالحق نے غور کیا تو سرسید کی شخصیت کا ایک دوسرا روپ سامنے آیا۔ ان کے سینے میں کیسا نرم اور مخلص دل چھپا ہوا ہے۔ ایک بچے کو خوش کرنے کے لیے انہوں نے اپنی حیثیت کا بھی خیال نہیں کیا۔ شاید یہی درد پوری قوم کے بچوں کے لیے ان کے دل میں تھا۔

گرمیوں کی چند دوپہروں میں یہ کام نمٹ گیا۔ اس کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ سرسید سے اس کی قربت بڑھ گئی۔ وہ کام میں مصروف ہوتا اور بیچ بیچ میں سرسید اس سے باتیں بھی کرتے جاتے۔ اس کے علمی ذوق نے سرسید کے دل میں جگہ بنالی۔ اب وہ اکثر ان کی خدمت میں حاضر ہوجاتا۔ انہیں اٹھتے بیٹھتے، لکھتے پڑھتے دیکھتا۔ ان سے ہم کلام ہوتا۔ لکھنے پڑھنے میں ان کا ہاتھ بٹاتا۔ ان سے سیکھتا۔

یہ سلسلہ چل ہی رہا تھا کہ سید محمود (سرسید کے بیٹے) ہائی کورٹ الہ آباد سے استعفیٰ دے کر علی گڑھ آگئے۔ معلوم ہوا چیف جسٹس، ہائی کورٹ الہ آباد سے ان بن ہوگئی تھی۔ لہٰذا ملازمت چھوڑدی۔ ایک دن عبدالحق، سرسید احمد خان سے ملنے ان کی کوٹھی پر پہنچا تو سید محمود سے ملاقات ہوگئی۔ وہ اسے اپنے کمرے میں لے گئے۔ یہ اس کوٹھی کا سب سے بڑا کمرا تھا۔ لیکن نہایت بے ترتیب۔ ہر طرف کاغذات اور کتابیں پھیلی ہوئی تھیں۔

"تمہاری قابلیت کے بہت چرچے ہونے لگے ہیں۔" انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

وہ کیا کہتا۔ ہنس کر چپ ہوگیا۔ سید محمود نے اسے بیٹھنے کو کہا۔

"جانتے ہو، یہ کاغذات کیوں بکھرے ہوئے ہیں۔ اور میں کیا لکھ رہا ہوں۔"

"یقیناً کوئی اہم تالیف ہوگی جو آپ اتنے مستغرق ہیں۔"

"چیف جسٹس، الہ آباد نے گورنمنٹ کو میرے خلاف ۷۵ صفحے کی رپورٹ لکھ کر بھیجی ہے۔ میں اس کا جواب لکھ رہا ہوں۔ کم از کم پانچ سو صفحے لکھوں گا۔"

"میں نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ آپ کوئی اہم تالیف سپرد قلم کررہے ہیں۔"

"کئی اور کام بھی پیش نظر ہیں جنہیں مکمل کرنا ہے" کچھ دیر توقف کرنے کے بعد انہوں نے کہا "تمہیں میرا ہاتھ بٹانا ہوگا۔"

"میں ان قانونی پیچیدگیوں کو کیا سمجھوں گا۔"

"تم حوالے تلاش کرسکتے ہو۔ اقتباسات کی نقل کرسکتے ہو۔"

"ہاں، یہ کام تو میری طبیعت کے ہیں۔"

"سہ پہر کو آجایا کرو۔ میرا کچھ کام ہلکا ہوجائے گا۔"

وہ ہر شام ان کے ساتھ گزارنے لگا۔ کام کرتے کرتے رات ہوجاتی تو وہ اسے رات کے کھانے کے لیے روک لیتے۔ کھانے پر سرسید بھی ہوتے۔ کسی نہ کسی موضوع پر گفتگو بھی چلتی رہتی۔

یہ کالج کی کلاسوں سے الگ ایک درس گاہ تھی جہاں وہ تعلیم حاصل کررہا تھا۔ باتوں باتوں میں اس نے وہ کچھ سیکھ لیا تھا جو بڑی بڑی کتابوں سے حاصل نہیں ہوسکتا تھا۔

ان صحبتوں کی بدولت اسے سرسید اور سید محمود کو نہایت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ ان کے کام کرنے کے طریقوں سے واقفیت ہوئی اور اس نے اپنے مستقبل کے لیے

اپنے ذہن میں ایک خاکہ تیار کرلیا۔
انہی صحبتوں میں اسے ان تمام لوگوں سے ملنے کا موقع ملا جو سرسید کے رفقا میں تھے۔ یہیں اس کی ملاقات مولانا الطاف حسین حالی سے ہوئی۔ یہ ملاقات اس طرح ہوئی جیسے دو یکساں روحیں آپس میں ملتی ہیں۔ انہیں دیکھ کر اسے اپنا بچپن یاد آنے لگا۔ وہ کسی تقریب میں شریک تھا۔ اس تقریب میں مجرا بھی ہونا تھا۔ اسے مجرے کا مفہوم بھی معلوم نہیں تھا لیکن جب سب بزرگ بیٹھ چکے اور طوائف ناچنے کے لیے کھڑی ہوئی تو اس نے جانا کہ مجرا یہ ہوتا ہے۔
فجر کی اذان میں کچھ دیر باقی تھی۔ صبح صادق کا سماں تھا کہ طوائف نے ایک عجیب وغریب چیز چھیڑ دی۔
ان اشعار کا جادو تھا یا طوائف کی درد بھری آواز یا پھر صبح کی ہلکی ہلکی روشنی کا اثر۔ ہر آنکھ سے آنسو رواں ہوگئے جیسے رات بھر کی غفلت کے بعد کسی نے عاقبت یاد دلادی ہو۔
اس وقت اسے معلوم بھی نہیں تھا کہ یہ کلام کس کا ہے۔ بعد میں جب اس نے دو چار کتابیں پڑھ لیں تو اسے معلوم ہوا کہ وہ مسدس حالی کے بند تھے جو اس طوائف کے ہونٹوں سے ادا ہو رہے تھے اور سننے والوں کے دلوں میں اتر رہے تھے۔ آج اس کلام کا خالق اس کے سامنے بیٹھا تھا۔
وہ سرسید کی کوٹھی میں بہت سے اکابرین سے ملا تھا لیکن حالی کو دیکھ کر اسے یوں لگا جیسے یہ شخص اس کے اندر جذب ہوتا جارہا ہے۔ اس وقت جتنے ستارے آسمانِ ادب پر فروزاں تھے، اس نے سب سے زیادہ روشنی اس ستارے میں دیکھی۔ سرسید ادیب سے زیادہ مصلح تھے۔ ڈپٹی نذیر احمد کی شخصیت میں زیادہ جاذبیت نہیں تھی۔ آزاد کی ادبی شخصیت میں دل کشی تھی مگر تابناکی نہ تھی۔ شبلی کے مزاج میں بڑی حد تک انانیت کا دخل تھا۔ ان کی خود پرستی عبدالحق کے مزاج کے برخلاف تھی۔ حالی کو دیکھ کر اسے محسوس ہوا کہ اس کا اپنا مزاج مجسم ہو کر سامنے آگیا ہے۔ وہ ان سے متاثر نہیں ہوا بلکہ گرویدہ ہوگیا۔
حالی نہایت سادہ طبیعت تھے۔ عبدالحق بھی سادہ مزاج اور نیک سرشت تھا۔ حالی کی سرشت میں غرور کا شائبہ تک نہیں تھا۔ فراخ دل تھے اور اپنے سے چھوٹوں کی تعریف کرنے میں بخل سے کام نہیں لیتے تھے۔ عبدالحق بھی منکسرالمزاج اور کشادہ دل واقع ہوا تھا۔ حالی شہرت کے طلب گار نہیں تھے۔ عبدالحق بھی یہی چاہتا تھا کہ شہرت سے دور رہ کر بس سر جھکا کر کام کرتا رہے۔ پھر اس میں اور سرسید میں سب سے بڑا اتحاد یہ تھا کہ حالی بھی سرسید کے عقیدت مند تھے اور خود وہ بھی۔ پہلی ہی ملاقات میں حالی کا احترام جو اس کے دل میں تھا، محبت میں تبدیل ہوگیا۔
حالی ان دنوں کالج کی عمارت ہی میں مقیم تھے۔ لٰہذا وہ ان کے پاس جانے لگا۔ حالی ان دنوں "حیاتِ جاوید" کی تالیف میں مصروف تھے۔ اور ساتھ ہی "یادگارِ غالب" کو بھی ترتیب دے رہے تھے۔
وہ جب حالی کے پاس پہنچا تو ان کے دل پر بھی یقیناً وہی اثر ہوا جو اس نے محسوس کیا تھا۔ انہوں نے کچھ اپنے مزاج اور کچھ اس کی پیاس کے مطابق اس کے ساتھ ایسا مشفقانہ رویہ اختیار کیا کہ اس کی گرویدگی شیفتگی میں تبدیل ہوتی گئی۔ وہ کام کرتے ہوئے ان کے انہماک کو دیکھتا۔ ایک ایک حوالے کے لیے وہ جتنی محنت اور چھان پھٹک کرتے، اسے ملاحظہ کرتا۔ ان کے طرزِ اسلوب کو بار بار ذہن میں بٹھاتا۔ ایک خاموش تربیت تھی جس سے وہ گزر رہا تھا۔
حالی سے ملاقات کے بعد اس کی دنیا ہی بدل گئی۔ لاشعوری طور پر اس کے اندازِ تحریر پر حالی کی پرچھائیاں پڑنے لگیں۔ اس نے بھی حالی کی طرح سادگی، سلاست، روانی اور صفائی کو اپنی نثر کا خاصہ بنالیا۔ عربی اور فارسی کے مشکل الفاظ کی جگہ ہندی الفاظ نے لے لی۔
"جس میں سنورنے کی صلاحیت ہوتی ہے، اس میں بگڑنے کے بھی لچھن ہوتے ہیں۔"
(زبانِ اردو پر سرسری نظر)
حالی کی طرح اس نے بھی محاورات کے فطری استعمال پر زور دینا شروع کردیا جس سے اس کی نثر میں ایک نئی شان پیدا ہونے لگی۔ متانت اور سنجیدگی کی فضا خود بخود اس کی نثر میں پاؤں پھیلانے لگی۔ حالی کی طرح اس کا مزاج بھی سائنسی ہوتا چلا گیا۔ عبارت آرائی اور رنگینی کلام سے کام لینے کے بجائے اپنے نظریات کو صحیح اور جچے تلے الفاظ میں پیش کرنے کا عادی ہوگیا۔ غرض یہ کہ جب وہ مولانا حالی کی بزم سے اٹھا تو بہت کچھ لے کر اٹھا۔
اردو کے بہترین مضمون پر ایک تمغا لارڈ لیس ڈاؤن ملا کرتا تھا۔ جب یہ تمغا اسے ملا تو صاف ظاہر ہونے لگا کہ اردو کی تاریخ میں ایک بڑے ادیب کا اضافہ ہونے والا ہے۔ سرسید احمد خان نے اس کی صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے اپنے پرچے "تہذیب الاخلاق" میں بھی کام لینا شروع کردیا تھا۔
علی گڑھ کالج کہنے کو ایک محدود عمارت تھی لیکن اس محدود دنیا میں ایک لامحدود دنیا آباد تھی۔ اس دنیا میں تعلیم، تہذیب اور سیاست کے پھول کھِلتے تھے۔ یہاں سے اٹھنے والی

آواز تمام مسلمانوں کی آواز بن جاتی تھی۔ ہندوستان بھر کے مسلمانوں کی جولانگاہ تھی یہ عمارت۔ بیدار ذہنوں کی پرورش گاہ تھی یہ عمارت۔ یہاں پہنچ کر مٹی، سونا اور سونا کندن بنتا تھا۔

عبدالحق نے اس دانش کدے میں اپنی زندگی کے چھ سال بسر کیے اور چھ صدیوں کا تجربہ لے کر گھر لوٹ آیا۔

سرسید احمد خان جیسا مصلح اعظم اور ہمہ گیر انسان، ہندوستان تو ہندوستان دنیا میں اپنی مثال آپ تھا۔ عبدالحق نے اسی عظیم انسان کی آنکھیں دیکھی تھیں۔ اس کو اٹھتے بیٹھتے، لکھتے پڑھتے دیکھا تھا۔ کس طرح ممکن تھا کہ نوجوان عبدالحق کے دل میں کام کرنے کی لگن، پابندی وقت کا خیال، نفاست پسندی، اعلانِ حق میں بے باکی اور جرأت کا خیال پیدا نہ ہوتا۔

اس کے ذہن میں یہ بات راسخ ہو چکی تھی کہ مسلمانوں کی بقا، اردو کی ترقی میں مضمر ہے۔ کوئی زبان محض زبان نہیں ہوتی بلکہ اس قوم کی تاریخ، اس کا کلچر اور اس کی تہذیب ہوتی ہے۔ اگر اردو زبان ہاتھ سے گئی تو کچھ بھی باقی نہیں بچے گا۔ ہندی، اردو کا جھگڑا ۱۸۶۷ء ہی میں سر اٹھا چکا تھا۔ سرسید نے اسے دبانے کی حتی الامکان کوشش کی تھی لیکن اب بھی یہ جھگڑا مختلف صورتوں میں سر اٹھاتا رہتا تھا۔ نوجوان عبدالحق کو احساس تھا کہ یہ جھگڑا وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتا جائے گا۔ اس طوفان کے سامنے بند باندھنے کی ضرورت ہے۔ ادب محض عیاشی نہیں، قومی خدمت بھی ہے۔ سرسید کے بعد ایک سپاہی کی ضرورت ہے جو اردو کے دفاع کا سپاہی ہو۔

وہ ان خیالوں کو اپنے ذہن میں سجائے اپنے وطن ہاپوڑ میں بی اے کے رزلٹ کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ ہاپوڑ کا پہلا نوجوان تھا جس نے انگریزی تعلیم حاصل کی تھی اور سراپا اردو بن کر زندہ رہنا چاہتا تھا۔

یہ زمانہ اس کے لیے نہایت جذباتی تھا۔ خیالوں کے ہجوم اسے گھیرے ہوئے تھے اور وہ اس بھیڑ میں اپنے لیے راستہ بنانے کی تگ و دو کر رہا تھا۔

اس کے والدین اس کا مستقبل اس کی شاعری میں تلاش کر رہے تھے۔ خیال یہی تھا کہ وہ شادی سے کیوں انکار کرے گا۔ اس لیے اس سے پوچھنے کی کسی نے ضرورت بھی محسوس نہیں کی۔

اس کی بہن کی شادی ہاپوڑ کے ایک زمیندار گھرانے میں ہوئی تھی۔ اس کی ماں نے اسی گھرانے کی ایک لڑکی اس کے لیے پسند کر لی۔

"ہم چاہتے ہیں، اب تمہاری شادی کر دی جائے۔" اس کے والد نے کہا۔

وہ باپ کے سامنے تو زبان نہیں کھول سکا لیکن ماں کے سامنے پہنچ کر اس نے صاف انکار کر دیا۔

"مجھے ابھی زندگی میں بہت کچھ کرنا ہے۔ ابھی میں شادی نہیں کر سکتا۔"

"اوئی بچے، شادی کے علاوہ بھی زندگی میں کچھ کرنے کو ہوتا ہے؟"

"ابھی تو میری نوکری کا بندوبست بھی نہیں ہوا ہے۔" اس نے دوسرا بہانہ کیا۔

"گھر میں کیا کھانے کو نہیں ہے۔ بس تو شادی کر لے۔ نوکری ہوتی رہے گی۔"

"اماں، تم سمجھتی کیوں نہیں ہو۔ میں ابھی شادی نہیں کرنا چاہتا۔"

"یہ تمہارے باپ کا حکم ہے۔ انہیں منع کرنے کی مجھ میں تو ہمت ہے نہیں۔"

ان میں منع کرنے کی ہمت نہیں تھی لیکن وہ انہیں بتا تو سکتی تھیں کہ عبدالحق تیار نہیں ہے۔

دوسرے ہی دن اس کے باپ نے اسے اپنے حضور طلب کر لیا۔

"سنا ہے، آپ شادی کرنا نہیں چاہتے۔"

"فی الحال نہیں کرنا چاہتا۔"

"کیوں؟"

"میری زندگی کسی ڈھب پر تو آ جائے۔"

"صاف کیوں نہیں کہتے کہ تم ہمیں یہ خوشی دینا ہی نہیں چاہتے۔ جب ہماری آنکھیں بند ہو جائیں گی، اس وقت کرو گے شادی۔"

"یہ بات نہیں ہے۔"

"یہی بات ہے۔"

"دوسری بات یہ بھی ہے کہ اس گھر میں میری بہن بیاہی گئی ہے۔ اسی خاندان کی لڑکی سے میرا شادی کرنا مناسب نہیں۔"

"اچھا جی، تو اب آپ چار کتابیں پڑھ کر یہ بھی سمجھنے لگے کہ جو کچھ ہم سوچتے ہیں وہ نامناسب ہے۔ شادی ابھی ہوگی اور جہاں ہم کہتے ہیں وہیں ہوگی۔"

اب مزید بحث کی گنجائش نہیں تھی۔ اس نے سر جھکا لیا۔ نہ انکار کیا نہ اقرار، بس خاموش ہو گیا۔ ماں خوش

ہوگئی کہ بیٹا مان گیا۔ عبدی بھائی کی شادی ہو رہی ہے' دوسرے کہتے رہے' وہ سنتا رہا۔

جیسے جیسے شادی کا دن قریب آرہا تھا' اس پر گھبراہٹ طاری ہوتی جارہی تھی۔ کیا میں اسی لیے علی گڑھ گیا تھا کہ واپس آکر شادی کے بندھن میں جکڑ دیا جاؤں۔ پھر اسی طرح زندگی گزارنے لگوں جس طرح ہندوستان کے لاکھوں لوگ گزار رہے ہیں۔ سیکڑوں عزائم اس کے سینے میں مچل رہے تھے جنہیں وہ ایک ایک کرکے مرتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

اب جبکہ شادی ہو ہی رہی ہے تو بیوی کو دینے کے لیے کوئی تحفہ بھی تو ہو۔ وہ تحفہ خریدنے کے لیے میرٹھ چلا گیا۔ واپس آیا تو چاندی کی کٹاؤدار ڈبیا اس کی شیروانی کی جیب میں پڑی تھی۔ اس ڈبیا میں سچے آب دار موتی جھم جھم چمک رہے تھے۔

روایتی گھرانوں کی طرح روایتی دھوم دھام سے برات روانہ ہوئی۔ گیس کے ہنڈوں کی جگ مگ کرتی روشنی میں طوائفیں خوب ناچیں۔

دلہن گھر آگئی۔ عبدی بھائی کی شادی ہوگئی۔ دوسرے دن ولیمہ تھا۔ ولیمے کی تیاریاں ہونے لگیں۔

رات آگئی۔ دلہن اپنے کمرے میں بیٹھی' اس کے قدموں کی آہٹ پر کان لگائے ہوئے تھی۔ اس کے جی میں جانے کیا آئی کہ موتیوں کی ڈبیا شیروانی کی جیب میں ڈالی اور غسل خانے کے دروازے سے نکل کر فرار ہوگیا۔

پکڑے جانے کے خوف نے اسے گھر سے بہت دور بمبئی پہنچادیا۔

وہ کسی منزل اور ارادے کے بغیر بمبئی آگیا تھا۔ ایک چھوٹے سے ہوٹل میں بیٹھا سوچ رہا تھا کہ اب اسے کیا کرنا چاہیے۔ کچھ پیسے جیب میں ہیں۔ اگر کوئی چھوٹی موٹی تجارت کی جائے تو اس بڑے شہر میں کاروبار خوب چمکے گا۔ اس ارادے کے بعد وہ کاروبار کے انتخاب کے لیے بمبئی کے بازاروں کا گشت کرنے لگا۔

ایک دن اس کی ملاقات محسن الملک سے ہوگئی۔ جو سرسید کے ساتھیوں میں تھے اور اب ریاست حیدر آباد میں معتمدِ مال تھے۔ تبدیلی آب وہوا کے لیے بمبئی آئے ہوئے تھے۔ علی گڑھ میں عبدالحق سے ان کی کئی ملاقاتیں ہوچکی تھیں لہٰذا دیکھتے ہی پہچان لیا اور اپنے ساتھ اپنی قیام گاہ پر لے گئے۔

محسن الملک کو ہنسی آگئی جب انہیں اس کی زبانی یہ معلوم ہوا کہ وہ تجارت کرنا چاہتا ہے۔

"تجارت تمہارے بس کا روگ نہیں۔ ہر نوکری تم کر نہیں سکتے۔ کر بھی لی تو دفتر کے بابو ہوکر رہ جاؤ گے۔ نوکری ایسی ہونی چاہیے جہاں تمہارے جوہر چمکیں۔"

"ایسی نوکری مجھے کون دے گا؟"

"ریاستِ حیدر آباد میں آج کل اہلِ علم کی بے حد قدردانی ہو رہی ہے۔ تم فوراً حیدر آباد چلے جاؤ۔"

"یہ آپ نے اور اچھی کہی۔ وہاں کون ہے جو مجھے جانتا ہے۔"

"میں تو جانتا ہوں۔ بھئی' تم میرا رقعہ لے کر جاؤ گے۔ جاتے ہی نوکری مل جائے گی۔"

محسن الملک نے ایک خط وقار الملک مولوی مشتاق کے نام لکھ کر انہیں دے دیا۔ وہ اس سفر کی طرف روانہ ہوگیا جہاں آبلوں کا امکان تو تھا لیکن انہی آبلوں میں باغِ اردو کی زندگی پوشیدہ بھی تھی۔

محسن الملک کی سفارش ہو اور نوکری نہ ملے' یہ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ مدرسۂ آصفیہ میں بطور ہیڈ ماسٹر ان کا تقرر ہوگیا۔

یہ نوکری اس اعتبار سے تو جاذبِ نظر نہیں تھی کہ لکھنے پڑھنے یا تحقیق و تنقید کے مواقع ملتے لیکن قدم جمانے کے لیے کسی کاروبار یا تجارت سے بہتر سہارا تھا۔ انہیں اس وقت ایسے ہی کسی سہارے کی ضرورت تھی۔

حیدر آباد کی علمی فضا اور قدردانی نے اس کے پاؤں پکڑ لیے۔ معمولی سی ہیڈ ماسٹری کی توقیر ہی کیا لیکن جس طرح حیدر آباد کے علمی حلقوں اور اہلِ اقتدار نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا اس سے اسے اندازہ ہوگیا کہ اس ریاست میں آگے بڑھنے کے بہت مواقع ملیں گے۔

وہ ایک دن اپنے سامان کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا کہ اسے وہ ڈبیا نظر آگئی جس میں موتی رکھے تھے۔ وہ بہت دیر تک اس ڈبیا کو دیکھتا رہا۔ کئی منظر آنکھوں کے سامنے آئے اور اوجھل ہوگئے۔ میرے گھر والوں کو تو یہ بھی معلوم نہ ہوگا کہ میں کہاں ہوں اور کس حال میں ہوں۔ اس کے ساتھ ہی اسے وہ دلہن یاد آگئی جسے وہ چھوڑ کر آیا تھا۔ وہ اب تک میرے انتظار میں بیٹھی ہوگی۔ اس کے تو پاؤں سُن ہوگئے ہوں گے۔ اس کا انتظار اب ختم ہوجانا چاہیے۔ اس نے طلاق نامہ لکھا اور گھر کے پتے پر روانہ کردیا۔

یہ ملازمت کرتے ہوئے اسے چار سال ہوگئے تھے۔ یہ مدت اس جیسے لائق آدمی کے لیے' اعلیٰ حلقوں میں اپنی جگہ بنانے کے لیے کم نہیں ہوتی۔ پھر نہ گھر بار کی فکر تھی نہ بال

بچوں کی۔ اسے اپنی اہمیت منوانے کی فرصت خوب مل رہی تھی۔

وہ ایک دن اپنے دفتر میں بیٹھا تھا کہ افسر بارجنگ، افواجِ آصفیہ کے سپہ سالار اس سے ملاقات کے لیے آئے۔ جلد ہی یہ بھی معلوم ہوگیا کہ وہ کیوں آئے ہیں۔ وہ ایک ماہ نامہ "افسر" نکالنا چاہتے تھے۔

"بڑی خوشی کی بات ہے۔ اردو میں رسائل کی بہت کمی ہے۔ اُردو کی ترقی کے لیے رسائل کا ہونا بہت ضروری ہے۔ ان کے ذریعے لکھنے والوں کو تحریک ملے گی۔ اردو کے ادبی ذخیرے میں اضافہ ہوگا لیکن یہ چونکہ بھاری پتھر ہے اس لیے لوگ چوم کر چھوڑ دیتے ہیں۔" عبدالحق نے اچھی خاصی تقریر کرڈالی۔

"یہ بھاری پتھر آپ کو اٹھانا ہوگا۔"

"مجھے؟"

"جی ہاں، اس کے مدیر آپ ہوں گے۔ اس کے لیے مجھے آپ سے زیادہ مناسب آدمی اور کوئی نظر نہیں آتا۔"

"میں اپنی مصروفیت کا بہانہ کرسکتا تھا لیکن یہ اردو کا معاملہ ہے اس لیے انکار نہیں کروں گا۔"

اب وہ ملازمت کے ساتھ ساتھ رسالہ "افسر" کو بھی ایڈٹ کرنے لگا۔ پیاسے کو چند قطرے پانی کے مل گئے۔ اس کام سے اسے ذہنی مناسبت تھی۔

اس کی محنت سے یہ رسالہ ایک معیاری رسالے کے روپ میں ظاہر ہوا۔ خود اس کے لیے بھی مفید ثابت ہوا۔ اس کی ابتدائی نگارشات اسی پرچے میں شائع ہوئیں۔ چیزوں کو جانچنے اور ان پر تبصرے کرنے کی صلاحیت بھی پیدا ہوئی۔

اس پرچے میں کام کرتے ہوئے اسے یہ مشکل ایک سال گزرا ہوگا کہ اسے ہوم سیکریٹری عزیز مرزا نے طلب کرلیا۔ انہیں اپنے دفتر کے لیے ایک مترجم کی ضرورت تھی۔ عبدالحق سے بہتر آدمی اس کام کے لیے بھی کوئی دوسرا نہیں تھا۔

اسی دفتر میں وہ دس سال تک کام کرتا رہا۔ ایک مرتبہ پھر محکمۂ تعلیم کو یاد آگیا۔ ۱۹۱۱ء میں اسے ڈائریکٹر تعلیم کے مددگار کے طور پر بلالیا گیا۔ ایک سال بعد اسے صوبہ اورنگ آباد کا انسپکٹر آف اسکولز بنادیا گیا لہٰذا اسے اورنگ آباد جانا پڑا۔

○☆○

۱۹۰۲ء میں دلی میں شاہی دربار ہوا تھا۔ اس وقت لارڈ کرزن وائسرائے تھے۔ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس نے بھی اپنا

نوجوان دلوں کے لئے
ایک خوبصورت کتاب

"رنگ چاہت کے"

انجم انصار کے کھٹے، میٹھے، تیکھے اور چنچل افسانوں کا مجموعہ "رنگ چاہت کے" بہت محدود تعداد میں شائع ہوچکا ہے۔ آج ہی منی آرڈر، چیک، ڈرافٹ یا کسی بھی طریقے سے کتاب کی قیمت بھیج کر "رنگ چاہت کے" فوری منگوالیں۔

پاکستان میں کتاب کی قیمت
مع محصول ڈاک -/150 روپے۔

غیر ممالک میں کتاب کی قیمت 15 ڈالر

لاہور۔ فون نمبر۔ 7230423 (042)

پتا
ساگر پبلشرز۔ 7A۔ لوئر مال۔
داتا دربار روڈ۔ لاہور۔ 54000

سالانہ جلسہ کیا۔ اس کانفرنس نے اپنی قرارداد میں چار ذیلی شعبے قائم کئے۔ ایک مدارس کا، دوسرا اصلاح تمدن کا۔ تیسرا تعلیم نسواں کا اور چوتھا اردو کا جو انجمن ترقی اردو سے موسوم ہوا۔ پروفیسر آرنلڈ اس کے صدر اور مولانا شبلی پہلے سیکریٹری منتخب ہوئے۔

مولانا شبلی نے استعفیٰ دے دیا تو دسمبر ۱۹۰۵ء میں ان کی جگہ مولوی حبیب الرحمٰن خاں شیروانی سیکریٹری منتخب ہوئے۔ جلد ہی پروفیسر آرنلڈ انگلستان واپس چلے گئے۔ ارکانِ انتظامی بھی تقریباً سب کے سب حیدر آباد دکن میں تھے اس لیے انجمن کا تمام نظام درہم برہم ہو کر رہ گیا تھا۔ اس صورتِ حال میں مولوی حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کوئی قابلِ ذکر کام انجام نہ دے سکے۔ انجمن صرف کاغذ تک محدود ہو کر رہ گئی۔ بالآخر وہ اپنے عہدے سے دست بردار ہو گئے۔ ان کی جگہ مولوی عزیز مرزا کو نیا سیکریٹری بنایا گیا۔ ان سے بڑی امیدیں تھیں لیکن ان کی زندگی نے وفا نہ کی۔

۱۹۱۲ء میں علی گڑھ کی تعلیمی کانفرنس کا سالانہ اجلاس دہلی میں ہوا۔ اس اجلاس میں یہ بات سب نے محسوس کی کہ ترقی اردو کا شعبہ لاوارث بچے کی طرح کسی سرپرست کی تلاش میں ہے۔

کانفرنس کے سربراہ صاحب زادہ آفتاب احمد خاں نے سیکریٹری کے عہدے کے لیے مولوی عبدالحق کا نام پیش کیا۔ ان کی خدمات اور صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے بالاتفاق ان کے نام کی منظوری دے دی گئی۔

عبدالحق چونکہ ملازمت کے سلسلے میں اورنگ آباد میں مقیم تھے اس لیے انہوں نے اپنا صدر دفتر وہیں قائم کیا۔

وہ اس انتظار میں تھے کہ جب دفتر منتقل ہوگا تو نہ جانے کتنا بھاری سامان اترے۔ گھر میں جگہ بھی ہوگی کہ نہیں۔

"دفتر کا سامان آگیا ہے" قاصد نے اطلاع دی اور وہ بھاگم بھاگ مکان کی طرف گئے۔

"کہاں ہے سامان؟"

"یہ کیا پڑا ہے۔"

ایک پرانا صندوق تھا جو بوسیدگی کی وجہ سے رسی سے کسا ہوا تھا۔ اسے کھولا تو اس میں ایک رجسٹر، چند پرانے اور غیر مرتب مسودات، ایک قلم دوات اور باقی اللہ کا نام۔ یہ تھی کل کائنات جس کے سہارے انہیں اردو کی جنگ لڑنی تھی۔ بہرحال جو بھی تھا یہی تھا۔ اسی میں گزارہ کرنا تھا۔ انہوں نے صندوق ایک کونے میں رکھا اور سوچنے بیٹھ گئے کہ اب انہیں کیا کرنا ہوگا۔

کئی مشکلیں ایک ساتھ آگئی تھیں لیکن سب سے بڑی مشکل سرمائے کی فراہمی کی تھی۔ انہیں سرسید یاد آگئے جو بات بات پر چندہ جمع کرنے نکل کھڑے ہوتے تھے اور آخر اتنے بڑے کالج کی عمارت کھڑی کرلی۔ مجھے بھی چندے کی مہم شروع کرنی چاہیے۔ انہوں نے سوچا لیکن یہ سوچتے ہی خود سے شرم آنے لگی۔ کسی کے سامنے ہاتھ کیونکر پھیلاؤں گا۔ چندہ مانگنے کے لیے ایک خاص طبیعت کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں جہاں جاؤں گا، مروت غالب آجائے گی۔ وہ ڈھٹائی کہاں سے لاؤں گا جو چندہ مانگنے کے لیے ضروری ہوتی ہے۔

ان میں ساری صلاحیتیں تھیں لیکن چندہ مانگنے کی صلاحیت خود میں نہیں پاتے تھے لیکن معاملہ انجمن کا اور اردو کی بقا کا تھا۔ دو ہی راستے تھے۔ وہ دفتر بند کردیں یا چندہ مانگنے نکل کھڑے ہوں۔ آخر انہوں نے دوسرے راستے کا انتخاب کیا۔ سنت گھر سے چلتی ہے۔ انہوں نے اپنا کل سرمایہ انجمن کی نذر کردیا۔ ہمدردوں کی صدائیں آنے لگیں۔

"مولوی صاحب نے اپنے مستقبل کے بارے میں کیا سوچا ہے۔ آخر وہ اپنا ذاتی سرمایہ اس قدر بے دردی سے کیوں خرچ کررہے ہیں۔"

مولوی صاحب دنیا کی اس ہمدردی سے قطعی خوش نہیں ہوئے بلکہ جھنجلا اٹھے اور پھر جو جواب انہوں نے دیا صرف وہی دے سکتے تھے۔

"یہ تم نے کیا کہا، میں اپنا ذاتی روپیا بے دردی سے کیوں خرچ کررہا ہوں، تمہارے بھائی یا بچے پر خدانخواستہ کوئی آفت پڑے تو کیا تم اس کی مدد نہ کروگے اور کیا ایسے وقت میں تم روپے کا منہ دیکھوگے۔ میرا تعلق انجمن سے ایسا ہی ہوگیا ہے کہ میں اسے اپنی ذات سے جدا نہیں سمجھتا اور انشاءاللہ یہ تعلق جب تک دم میں دم ہے ایسا ہی قائم رہے گا خواہ میں سیکریٹری رہوں یا نہ رہوں۔"

اس عزم اور ہمت سے کام کیا جائے تو ناکامی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ ایک ایک دروازے پر گئے۔ ہر دروازہ کھٹ کھٹایا۔ ان لوگوں کے آگے بھی ہاتھ پھیلایا جن سے ملنا بھی وہ عار سمجھتے تھے۔ کہیں سے صاف جواب ملا، کہیں سے جھولی بھر گئی۔

ان کی محنت اور جاں فشانی سے انجمن کے مرجھائے ہوئے پودے میں جان پڑنی شروع ہوگئی۔ عبدالحق کے ذاتی مراسم اور نیک نامی کی بدولت مملکتِ آصفیہ نے فیاضانہ مدد کی۔ اعلیٰ حضرت نظام نے انجمن کی سرپرستی قبول کی اور بارہ سو روپے سالانہ منظور ہوئے۔ ۱۹۲۱ء میں یہ رقم پانچ ہزار سالانہ ہوگئی۔ فرماں روائے بھوپال نے پچاس روپے ماہانہ منظور کئے۔ مستقل ارکانِ اعانت کی تعداد ۹۴ تک پہنچ گئی۔

کلکتہ، جالندھر اور بمبئی میں انجمن کی شاخیں اور کتب خانے قائم ہوگئے۔ انجمن کا دفتر ایک پرانے صندوق سے نکل کر میز، کرسی پر آگیا۔

○☆○

کسی زبان کی خدمت کرنے کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ علمی و ادبی سرمائے میں اضافہ کیا جائے۔ یہ کام شاعروں اور ادیبوں کا ہے۔ دوسرا کام یہ ہے کہ زبان کی نشرواشاعت اور ترقی کے لیے لوگوں کو آمادہ کیا جائے۔ یہ کام ان لوگوں کا ہے جو زبان کی ثقافتی اہمیت سے واقف ہوں جو یہ جانتے ہیں کہ زبان کے آئینے میں ان گنت تجربات، نئے نئے جلوے نظر آتے ہیں۔ قوم کی ترقی کا اندازہ اس قوم کی ترقی سے کیا جاتا ہے۔

پہلی صورت پر عمل کرنے والے تو بہت تھے مگر دوسری صورت سے سامنے آنے والا کوئی نہیں تھا۔ قدرت نے عبدالحق کی صورت میں ایک آدمی انجمن کے سپرد کردیا جس نے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ اس زبان کی ترویج واشاعت میں وقف کردیا۔ نہ دشمنوں کی پروا کی نہ پاؤں کے آبلوں کی۔ اس کا پیغام گھر گھر پہنچایا۔ خطابت کے سہارے دلوں کو گرمایا۔ انشاپردازی کے ذریعے ذہنوں کو جلا بخشی۔ اپنی فوج کے لیے مزید سپاہی تیار کئے۔ الغرض وہ سب کچھ کیا جو ایک رہنما کو کرنا چاہیے۔ یہ کام ہرگز اکیلے آدمی کے بس کا نہیں لیکن جب تک وہ اکیلا تھا، سب کام اکیلے ہی کئے۔ پھر یہ ہوا کہ لوگ آتے گئے اور قافلہ بنتا گیا۔

ترقی یافتہ زبان کی پہچان یہ ہوتی ہے کہ اس میں اعلیٰ درجے کا ادب موجود ہو۔ اس زبان نے زمانے کے سردوگرم زیادہ سے زیادہ دیکھے ہوں اور اس میں ہر موضوع پر کتابیں وافر مقدار میں ہوں۔ اردو کے پاس یہ سب کچھ تھا لیکن پردۂ حجاب میں تھا۔ تاریخ ادب کے کئی سو سال گمنامی کی مٹی میں دفن ہوگئے تھے۔ عبدالحق برسوں سے اس شہر میں آباد تھے جہاں یہ خزانے دفن تھے۔ انہیں اس کا شعور تھا لیکن وہ ان کی دسترس میں نہیں تھے۔ یہ کام ایک دو دن کا تھا بھی نہیں کہ چٹ منگنی پٹ بیاہ والا معاملہ ہوجاتا۔ اس کے لیے بڑے صبرواستقلال کی ضرورت تھی۔ وہ بھی انتظامی اور مالی امداد ہی میں الجھے ہوئے تھے۔ ذرا فراغت ملی تو انہوں نے ذاتی رسوخ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے حیدرآباد دکن کے علمی خزانوں کو اپنے قبضے میں کرلیا۔ قدیم اردو کے مخطوطات نہ جانے کہاں کہاں دبے پڑے تھے۔ انہیں تلاش کیا۔ دولت خرچ کی، خوشامدیں کیں۔ تعلقات استعمال کئے اور قلمی نسخے حاصل کرلیے۔

"ہمیں صرف اپنے اسلاف کی پونجی ہی پر قانع نہیں رہنا چاہیے بلکہ ہمیں خود بھی اپنے زمانے کے حالات کی رو سے ترقی اور اصلاح کی۔ لگاتار اور بے دریغ کوشش کرتے رہنا چاہیے۔ اس میں شک نہیں کہ ہمارے لیے گزشتہ زمانے میں بہت کچھ ہے لیکن سب کچھ نہیں۔ اس لیے اصلاح کی طرف سے کبھی غافل نہیں رہنا چاہیے۔ جو چیزیں فرسودہ اور بے کار ہوگئی ہیں اس کے بدلنے اور ترک کرنے میں اور جو کارآمد اور مفید ہیں، ان کے اختیار کرنے میں کبھی نہیں چوکنا چاہیے۔"

(اقتباس خطبات)

"تصویر جس قدر بڑی شاندار اور نفیس ہوتی ہے، اسی قدر اسے پیچھے ہٹ کر دیکھنا پڑتا ہے تاکہ اس کے خط وخال واضح طور پر نمایاں ہوسکیں اور صانع کے کمال اور تصویر کے حسن وقبح کا صحیح اندازہ ہوسکے۔ یہی حال بڑے لوگوں کا ہے، ہم عصر بے لاگ رائے دینے سے قاصر رہتے ہیں۔ ان میں موافق بھی ہوتے ہیں۔ موافق مخالف دونوں مبالغہ کرتے ہیں۔ ان میں مخلص بھی ہوتے ہیں اور ریاکار بھی اور بے نفس بھی۔ ایک مدت کے بعد جب مخالفوں اور حمایتوں کا غبار چھٹ جاتا ہے تو اصل حقیقت آشکارا ہوجاتی ہے۔"

(تمہید 'سوانح سرسید)
از مولوی عبدالحق

"قومی زبان کی اہمیت اور قوت کو بہت کم لوگوں نے سمجھا ہے۔ اس کا ہر لفظ، ہر جملہ، ہر محاورہ اور روزمرہ۔ اس کی ہر ترکیب ہماری تہذیب ہمارے ادب اور ہماری معاشرت کی جڑوں اور ریشوں تک پہنچی ہوئی ہے اور اس کے ایک ایک لفظ کے پیچھے ہماری تاریخ وتہذیب کا ایک بڑا سلسلہ ہے جس کی تہ میں ہماری زندگی کے نقوش کا ایک جال سا پھیلا ہوا ہے۔"

(عبدالحق)

ان مخطوطات کو پڑھنا، سمجھنا اور مصنفوں کے حالات کی چھان بین کرنا ایک اور دقت طلب مسئلہ ہے۔ اس کے لیے صبرِ ایوب کی ضرورت ہوتی ہے۔ مخطوطات کے رسم خط سے آگاہی بھی ایک خاص فن ہے۔ مصنفین کی عمر اور مخطوطات کے زمانۂ تصنیف وکتابت کا تعین بڑی تحقیق اور

علمی بصیرت چاہتا ہے۔

مولوی عبدالحق نے نہایت جاں فشانی سے ان قلمی نسخوں کو جمع کیا اور نہایت کاوش سے ان کا مطالعہ شروع کردیا۔ یہ سوچے بغیر کہ ساون کب آیا، سردی کب گزر گئی۔ انہیں اب یہ احساس ہوتا تھا کہ قدرت نے انہیں شادی کے بکھیڑے سے دور کیوں رکھا۔ گھرداری میں گھر کر یہ کام پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا تھا۔

اب سوال یہ تھا کہ ان پوشیدہ کارناموں کو ظاہر کیسے کیا جائے۔ باقاعدہ تصنیفات شائع کرنے کے لیے وقت اور پیسا درکار تھا اور اس وقت مقصود صرف اتنا تھا کہ ان قدیم ادب پاروں کی طرف اہلِ ادب کی توجہ دلائی جائے۔ بہت سوچ سمجھ کر انہوں نے ایک رسالہ نکالنے کی ٹھانی۔ اس کے ذریعے ان کی نگارشات بھی شائع ہوسکتی تھیں اور انجمن کے لیے آمدنی کا ذریعہ بھی بن سکتا تھا۔

رسالے کا نام کیا ہو؟ اس میں سوچنے کی بات ہی نہیں تھی۔ انہوں نے غور کیے بغیر اس کا نام "اردو" رکھ دیا۔ وہ یہ سب کچھ اُردو کے لیے ہی تو کر رہے تھے۔ ان کے تو کوئی اولاد بھی ہوتی تو ہر اولاد کا نام وہ اردو ہی رکھتے۔

رسالہ اردو کا پہلا شمارہ جنوری ۱۹۲۱ء کو شائع ہوا۔ اس شمارے میں انہوں نے اس عزم کا اظہار کردیا کہ انہیں آئندہ کیا کرنا ہے۔

"بہت سے ایسے مصنف اور شاعر ہیں جن کا کلام ابھی تک بساطِ قدردانی تک نہیں پہنچا۔ بہت سی کتابیں ہیں جو لکھنے کے بعد ہی گوشۂ گمنامی میں رہ گئیں یا شائع ہوتے ہی ناپید ہوگئیں۔"

"قلم کا مسافر آبلہ پا نہ ہو تو یہاں وہ منظر نظر آئیں گے جن کا لطف اٹھانے اور بیان کرنے کو اک عمر چاہیے۔ بہت سے خزانے ایسے ہیں جو ابھی تک پردہ خفا میں ہیں اور جنہیں ہوا تک نہیں لگی۔ ہمت جی نہ چرائے تو بہت سی کانیں ہیں جو ابھی کھودنی ہیں۔"

"میں چاہتا ہوں یہ رسالہ اردو زبان اور ادب کی ایسی مفید اور محققانہ بحثوں سے مالا مال ہو کہ شائقینِ ادب اسے غور اور شوق سے پڑھیں اور فائدہ اٹھائیں۔"

ان کی یہ تمنا پوری ہوئی۔ ان کی چشمِ تحقیق نے نایاب گنج ہائے گراں مایہ، پردۂ خفا سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالے جس سے بلاشبہ اردو زبان و ادب کی تاریخ میں کئی صدی کا اضافہ ہوگیا۔ انہوں نے اردو زبان کی نشوونما، رسم الخط، زبان و ادب پر خود بھی عالمانہ مضامین لکھے اور دوسروں سے بھی لکھوائے۔

اب رسالہ اردو کے ذریعے ایک ایسا میدان ان کے ہاتھ لگ گیا تھا جہاں ان کا تحقیقی شوق پاؤں پھیلا سکتا تھا۔

جنوری ۱۹۲۲ء میں انہوں نے رسالہ اردو میں سلطان محمد قلی قطب شاہ کی کلیات پر ایک مقالہ شائع کیا۔ محمد علی کی کلیات پر سیر حاصل بحث کی۔ اس کے علاوہ نمونۂ کلام بھی شائع کیا، خوبیوں کو گنوایا اور محاسن اجاگر کیے۔

اس مضمون کے شائع ہوتے ہی اردو زبان و ادب سے شغف رکھنے والے حیرت زدہ رہ گئے۔ انہیں پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ اکبر و جہانگیر کے اس ہم عصر نے پچاس ہزار کے قریب اشعار چھوڑے ہیں۔

اب تک محمد حسین آزاد کے کہنے کے مطابق ولی دکنی کو اردو کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر قرار دیا جاتا تھا۔ اس تحقیقی مقالے نے نہ صرف یہ سہرا ولی کے سر سے اتار دیا بلکہ اردو شاعری کی تاریخ کو دو سو سال آگے بڑھادیا۔ یہ زبانِ اردو کے سلسلے میں ایک انقلاب انگیز انکشاف تھا۔

اسی طرح انہوں نے سلطان قلی قطب شاہ کے دور کے ایک نثرنگار اور شاعر ملاوجہی کی کتاب "سب رس" کا تعارف کرایا اور اس پر شاندار مقدمہ تحریر کیا۔

اس مقالے کی اشاعت سے قبل یہ سمجھا جاتا تھا کہ شاہ فضل اللہ فضلی کی "وہ مجلس" اردو نثر کی پہلی کتاب ہے۔

رسالہ اردو جولائی ۱۹۲۵ء میں "سب رس منظوم" کے عنوان سے ان کا ایک مضمون شائع ہوا جس میں یہ واضح کیا گیا تھا کہ وجہی کی "سب رس" اتنی مقبول ہوئی کہ شاہ حسین ذوقی اور مجری نے سب رس کے قصے کو منظوم کیا۔ اسی بہانے انہوں نے ان دونوں مصنفین کے بارے میں نہایت تحقیقی معلومات فراہم کیں۔

قدیم اردو پر ایک لامتناہی سلسلہ تھا جو رسالہ اردو کے ذریعے پڑھنے والوں تک پہنچ رہا تھا اور اردو کے ادبی و علمی سرمائے میں اضافے کا سبب بن رہا تھا۔

سیکڑوں ایسے شاعر و ادیب جو گمنامی میں تھے ان کی کوششوں سے منظرِ عام پر آتے چلے گئے۔ قدیم اردو کا پورا خزانہ انہوں نے کھنگال ڈالا۔

ان کی سعی و تلاش نے نہ صرف اردو ادب کی تاریخ کو کئی صدی اُدھر تک وسیع کردیا، گیارھویں صدی ہجری کے بجائے ساتویں صدی ہجری میں اسے بولتے ہوئے سنادیا۔

انہوں نے انجمن اور دوسرے اداروں یا اشخاص کی طرف سے شائع ہونے والی کتابوں پر بلند پایہ مقدمات لکھے۔ ان مقدمات کے ذریعے دنیا کو یہ معلوم ہوا کہ وہ صرف ایک محقق ہی نہیں، تنقید نگار بھی ہیں۔

حالی اردو کے پہلے سوانح نگار تھے اور عبدالحق ان کے تربیت یافتہ لہٰذا انھوں نے بھی سیرت نگاری کے کئی نمونے پیش کیے۔ ان افراد کے بارے میں لکھا جو ان کے مشاہدے میں آئے تھے اور اس خوبی سے لکھا کہ ان کے یہ خاکے اردو ادب کا مستقل حصہ بن گئے۔ جو کچھ کہا بے لاگ انداز میں کہا۔ اپنی ذاتی پسند اور ناپسندیدگی کو حق اور سچ کا پردہ نہیں بننے دیا۔ ان خاکوں میں بھی ان کا تحقیقی مزاج کارفرما نظر آتا ہے۔ شخصیت کے ہر اچھے' بُرے پہلو تک ان کی نظر جاتی ہے۔ مرعوب ہونا ان کی فطرت ہی میں نہیں تھا لہٰذا ان کے یہ خاکے قصیدے کی شکل اختیار نہیں کرتے۔ آدمی کتنا ہی بڑا ہو ان کے خاکوں میں آدمی ہی نظر آتا ہے۔

ان خاکوں کی زبان بھی تنقیدی مضامین سے مختلف تھی۔ لفظ' ترکیبیں اور محاورے ان کے تابع فرمان نظر آتے تھے۔ عبارت میں متین' باوقار' پُرشکوہ فارسی اور عربی لفظوں کے شانہ بشانہ ایسے لفظ بھی صف بستہ نظر آتے تھے جنھیں دوسرے ادیب محض بولی ٹھولی سمجھ کر نظرانداز کردیتے ہیں۔

ان خاکوں نے انھیں محقق اور تنقید نگار سے ہٹ کر تخلیقی ادیب کی صف میں لا کھڑا کیا۔

غرضیکہ ان کی کاوشوں نے انھیں محقق' مؤرخ' ناقد' ماہرِ تعلیم' ماہرلسانیات' ادیب کے روپ میں پیش کیا لیکن ان سب پر حاوی اُن کی وہ خدمات تھیں جو وہ اردو کے فروغ کے لیے کررہے تھے۔

انجمن کا کام اب اتنا بڑھ گیا تھا کہ اس کے لیے اب علیحدہ مکان کی ضرورت تھی۔ لہٰذا وہ دفتر سمیت "نادر منزل" منتقل ہوگئے۔

یہ ایک پہاڑی نما ٹیکری پر بنی ہوئی نہایت شاندار کوٹھی تھی۔ گیٹ اور کوٹھی میں آدھ فرلانگ کا فاصلہ تھا۔ سڑک ایک بہت بڑے لان کے ساتھ گھومتی ہوئی پورچ تک آتی تھی۔ پھولوں کی کیاریاں پھولوں سے بھری ہوئی۔ لان کے اوپر ایک طرف بہت بڑا گھنا برگد کا درخت جس کے چاروں طرف چڑیوں کا پنجرہ۔

اندر داخل ہوجایئے تو پہلے بڑا ڈرائنگ روم پھر ایک بڑا ہال کمرا جس میں دیوار کے چاروں طرف کتابوں کی بہت اونچی اونچی الماریاں۔ درمیان میں ایک لمبی میز اور بہت سی کرسیاں۔ اس کے ساتھ ایک اور کمرا جو ان کا اپنا دفتر تھا۔ ہر طرف کتابوں کی اونچی الماریاں۔ ایک طرف لکھنے کا ڈیسک۔ کچھ فاصلے پر ایک آرام دہ کرسی جس کے قریب پیچواں (حقہ) رکھا ہوا۔ ایک طرف چھوٹی سی میز پر چائے کی پتی کے ڈبے پیالیاں اور چائے دان۔

"چند اقتباسات"

"جو نہ سمجھنا چاہے' اسے کون سمجھا سکتا ہے۔"

(خطبات)

"آنکھوں کے اندھے کو انگلی پکڑ کر رستہ دکھا سکتے ہیں لیکن عقل کے اندھے کے لیے رہنمائی کی کوئی تدبیر نہیں ہوسکتی۔"

(خطبات)

"زندگی بسر کرنا اور اسے صحیح طور سے برتنا ہی خود ایک بڑی نیکی ہے اور یہ تعلیم ادب کی اصل غرض وغایت ہے۔"

(خطبات)

"عقیدت اور محبت آدمی کو اندھا کردیتی ہے۔ تنقید نظر نیچی کرلیتی ہے اور انصاف ادھر منہ پھیرلیتا ہے۔"

(تنقیداتِ عبدالحق)

"اپنے سہارے آپ کھڑا ہونا خدا کی بڑی نعمت ہے اور بڑے پن کی علامت ہے جو دوسروں کا سہارا تکتا ہے وہ خود کبھی نہیں بڑھتا جو بڑھتا ہے تو جتنا پاتا ہے اس سے زیادہ کھوتا ہے۔"

(چند ہم عصر)

"ہر دور کا ایک تقاضا ہوتا ہے۔ اس تقاضے کو سمجھنا اور سمجھ کر اپنے ماحول اور حالات کی رو سے اپنی تنظیم کرنا اس کارزارِ حیات میں سنبھلے رہنے اور کامیاب ہونے کے لیے ضروری ہے۔"

(چند ہم عصر)

تین کمرے کاتبوں کے لیے مخصوص تھے۔ فرش پر جاجم بچھی ہوئی۔ پیلے رنگ کے کاغذ ہر طرف بکھرے ہوئے۔

ایک کمرا ان کے سونے کے لیے مخصوص تھا۔ ایک مسہری اور لوہے کی کیبنٹ کے علاوہ یہاں بھی کتابوں کی چھوٹی چھوٹی الماریاں تھیں۔

اسی طرح چند اور کمرے تھے جو انجمن میں کام کرنے والوں کے تھے۔ مثلاً عابد حسین' احتشام الحق' اختر حسین رائے پوری وغیرہ۔

یہ کوٹھی واقعی انجمن اردو کے شایانِ شان تھی جس میں کام کے وقت صرف کام ہوتا تھا۔ دفتری اوقات کے بعد ملنے والے آجاتے تھے لیکن دراصل یہ بھی ایک قسم کا کام ہی تھا کیونکہ یہ دوست بھی کسی نہ کسی ادبی نکتے پر بحث کرنے کے لیے ہی جمع ہوتے تھے۔

مولوی عبدالحق نے ہر بڑے آدمی کی طرح ایسے لوگ تیار کر لیے تھے جو ادبی کاموں میں ان کی معاونت کر سکیں۔ خود بھی سخت محنت کرتے تھے اور اپنے ساتھیوں سے بھی یہی توقع کرتے تھے۔ کسی رو رعایت کے قائل نہیں تھے۔ اس لیے غصہ ور اور اکل کھرے مشہور ہو گئے تھے حالانکہ اندر سے بہت نرم بھی تھے۔

مولوی صاحب کی نگرانی میں انجمن نے ترقی کے کئی زینے طے کر لیے۔ ہندوستان کے ہر حصے میں انجمن کی شاخیں قائم کر دی گئیں۔ ان شاخوں کے زیرِ نگرانی اردو مکتب اور کتب خانے کھولے گئے۔ اس ذریعے سے بہت سے ناخواندہ لوگوں نے اردو زبان سیکھی اور بعض ایسے علاقوں میں اردو کو پہنچایا گیا جہاں اس سے بہت کم لوگ واقف تھے۔

سرمائے کی فراہمی ہوتے ہی عبدالحق نے انجمن کی مطبوعات کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اہم ادبی کتابوں کو مرتب کروا کے شائع کیا۔ بہت سی اہم اور نادر کتابیں منظرِ عام پر آئیں۔ اس طرح معلوم ہوا کہ اردو زبان ہندوستان کی علاقائی زبان کی طرح کم مایہ نہیں۔ انجمن کے اس اقدام کی وجہ سے اردو ادب اور زبان کی تاریخ میں نمایاں تبدیلی بلکہ انقلاب رونما ہوا۔

انجمن نے اردو زبان کی تہی دامنی کو ختم کرنے کے لیے علمی و فنی کتابوں اور عالمی ادبیاتِ عالیہ کے تراجم کی طرف بھی توجہ کی۔ ایک ایسا انگریزی، اردو لغت بھی تیار کیا جس نے مترجمین کی مشکل کو آسان کر دیا۔ مختلف علوم کی اصطلاحات کو وضع کیا گیا۔

ان کی کامیابیوں کو دیکھتے ہوئے حکومتِ حیدر آباد نے اردو زبان کی جدید و مکمل لغت کی تالیف ان کے سپرد کی۔ یہ کام اتنا بڑا تھا کہ برسوں کی محنت درکار تھی کیونکہ مولوی صاحب کے الفاظ میں۔

"ہر لفظ کے متعلق یہ بتانا ہو گا کہ وہ کب، کس وقت اور کس شکل میں اردو زبان میں آیا اور اس کے بعد سے اس کی شکل و صورت اور معانی میں کیا کیا تغیر ہوئے اور اس کے کون کون سے معانی متروک ہوئے اور اس میں اب تک کون کون سے نئے معنی پیدا ہوئے۔ ان تمام امور کی توضیح کے لیے ادیبوں کے کلام سے نظائر پیش کرنے ہوں گے۔ ہر لفظ کی تحقیق کر کے یہ بتانا ہو گا کہ یہ کس زبان کا لفظ ہے اور اس کی صورت وہی ہے یا بدل گئی۔"

ظاہر ہے ان خطوط پر ایک جامع لغت کی ترتیب کس قدر دشوار اور محنت طلب امر تھا مگر مولوی عبدالحق نے بڑی حوصلہ مندی سے اس کام میں ہاتھ ڈالا۔ ہندی اور سنسکرت کے ماہرین کا تقرر عمل میں آیا۔ نظم و نثر کی مستند کتابوں سے اسناد ڈھونڈنے کے لیے کئی اصحاب کو مقرر کیا۔

اب تک دنیا انہیں ایک محنتی کارکن اور محقق کے طور پر جانتی تھی لیکن اس لغت کی تیاری کے مرحلوں کے دوران میں یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ بہت بڑے ماہر لسانیات بھی ہیں۔ الفاظ کی ساخت، ارتقائی تغیرات مرکبات و محاورات، لفظوں کے خاندان اور ان کے سفر پر ان کی نگاہ بہت گہری ہے۔ بات یہ تھی کہ وہ اردو کے عاشق تھے اور عاشقوں کے لیے پہاڑ کھود کر نہر نکالنا ناممکن نہیں ہوتا۔

انہوں نے معالج کا نہیں مسیحا کا کام انجام دیا۔ وہ مصنف جو معنوی طور پر مر چکے تھے، انہیں زندگی عطا کی۔ متعدد قدیم و نایاب تذکروں کا کھوج لگا کر انہیں ترتیب دیا۔

بیسیوں دکنی مخطوطات کو گم نامی کے عمیق غاروں سے نکال کر زندگی کی دھوپ سے آشنا کیا۔

ان کی ان کاوشوں نے اس عام نظریے کو باطل کر دیا کہ اردو لشکری زبان ہے اور جس نے مغل سلاطین خاص کر شاہجہاں کے عہد میں جنم لیا۔ انہوں نے بابر کی آمد سے بھی سو برس پہلے کی کتابیں دریافت کیں۔

ان کا ایمان تھا کہ مسلمانوں کی بہبود و ترقی کا دارومدار اردو کی ترقی اور ترویج پر ہے۔ ملک کے سیاسی حالات بھی اس طرف جا رہے تھے کہ آئندہ اردو پر برا وقت آنے والا تھا۔ اس صورتِ حال میں ضروری تھا کہ ذریعۂ تعلیم اردو ہو تاکہ اردو ایک زبان نہیں، مجبوری بن جائے لیکن یہ اس وقت ہو سکتا تھا جب کوئی ادارۂ تعلیم ایسا بنایا جائے جہاں اردو میں اعلیٰ تعلیم کا انتظام ہو۔ اس کام کی توقع غیروں سے رکھنا فضول تھا اور یہ کام تھا بھی ایسا کہ حکومتی امداد کے بغیر ممکن ہی نہیں تھا۔ وہ ایک ایسی یونیورسٹی کا خواب دیکھ رہے تھے جہاں ہر مضمون کی تعلیم اردو میں دی جائے۔ یہ کام حکومت ہند نہیں کر سکتی تھی۔ البتہ انہیں ۔۔۔ حکومت حیدر آباد کی ادب نوازی سے امید تھی کہ وہ یہ بارِ گراں اٹھا سکتی ہے۔ انہوں نے اپنی خواہش کا اظہار مختلف حلقوں میں کرنا شروع کر دیا۔ وہ اس وقت انسپکٹر آف اسکولز تھے اور تعلیم کا وسیع تجربہ رکھنے کی وجہ سے ان کی بات میں وزن ضرور تھا۔

سر اکبر حیدری نواب حیدر نواز جنگ وزیر تھے۔ سیاہ سفید کے مالک تھے۔ ریاست کے مالک تھے اور سب سے بڑی بات یہ کہ علم و ادب کے شائق تھے۔ عبدالحق نے یہ

ہٹلر کے عقائد اور نظریات

معاشرتی اصلاح کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ قوم کی تہذیب اور مالی انتظام میں جو بنیادی خلل ہے اسے دور کیا جائے۔ جب تک یہ خلل باقی ہے' انسان کا تنزل لازمی نتیجہ ہے۔ خود یہ خلل اگر انسان کو ذلیل نہیں کرتا تو کم از کم ذلت کے راستے پر ضرور ڈال دیتا ہے۔ کیا وجہ ہے کہ حکومت سے مزدور طبقے کی دشمنی دور نہیں کی جاسکتی؟ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ حکومت مزدور کی زبوں حالی کے اسباب شناخت کرنے میں ڈگمگاتی ہے۔ جب تک حکومت کو پہلے یہ سمجھ نہ آجائے کہ مزدور کیوں اس کے دشمن ہیں' اس دشمنی کے اسباب کو پوری سختی کے ساتھ جڑ سے اکھاڑ پھینکنا کیونکر ممکن ہوسکتا ہے۔ اقتدار کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں رکھنے والے اگر یہ نکتہ سمجھ لیں کہ قوم کو خیرات کی نہیں' مساوات کی ضرورت ہے تو سارا جھگڑا ہی ختم ہوجائے۔ قوم کی زبوں حالی دو طرح سے دور کی جاسکتی ہے۔ اوّل تو یہ کہ قوم میں باہمی ذمے داری کا شدید احساس پیدا کرکے ان بنیادوں کی اصلاح کی جائے جن پر سوشل ترقی کا دارومدار ہے۔ دوسرے یہ احساس پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ بغیر کوئی رحم کئے قوم کے جسم سے وہ تمام پھوڑے پھنسیاں کاٹ کر پھینک دینی چاہئیں جن کا علاج ناممکن ہے۔

آفتاب احمد نصیر' کورنگی کراچی

منصوبہ ان کے سامنے رکھا۔ انہیں بھی اسی طرح تعجب ہوا جس طرح دوسروں کو ہوتا تھا۔

"میں نہیں سمجھتا کہ یہ ممکن ہوگا۔ اردو سے محبت الگ بات ہے لیکن اس محبت کو اندھا نہیں ہونا چاہیے۔"

"نواب صاحب' میں نے اچھی طرح سوچ لیا ہے۔ آپ کی ریاست اگر مالی معاونت کرتی ہے تو پھر یہ کسی طرح مشکل نہیں۔"

"مولوی صاحب! کسی مدرسے میں بچوں کو اُردو میں سبق یاد کرادینا الگ بات ہے اور اس زبان میں اعلیٰ تعلیم دینا دوسری بات ہے۔"

"جناب' اردو کے ساتھ ہمیشہ یہی ہوا ہے۔ اب سے کچھ ہی برس پہلے تک یہ کہا جاتا تھا کہ اُردو کے پاس اتنا سرمایۂ الفاظ نہیں کہ اس میں ہر قسم کے موضوعات کو بیان کرنے کی طاقت ہو لیکن آپ نے دیکھا سرسید مرحوم نے اس خیال کو باطل کردیا۔ اب کوئی یہ نہیں کہتا۔ اب یہ کہا جارہا ہے کہ اردو میں تعلیم نہیں دی جاسکتی۔"

"اگر یہ اتنا آسان ہوتا تو سرسید یہ کام پہلے ہی کرچکے ہوتے۔"

"ان کے زمانے کی ضرورت دوسری تھی۔ ویسے ایک ورنیکلر یونیورسٹی قائم کرنے کا منصوبہ ان کے ذہن میں تھا ضرور۔ میری ان سے کئی مرتبہ اس موضوع پر بات ہوئی تھی۔"

"میں آپ جیسا لائق تو نہیں کہ بحث میں آپ سے جیت سکوں لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ ہر مضمون پر اردو میں کتابیں موجود نہیں۔ خاص طور پر سائنس کا میدان تو بالکل خالی ہے۔"

"میں آپ سے صد فیصد اتفاق کرتا ہوں لیکن کتابیں مہیا کی جاسکتی ہیں۔"

"وہ کس طرح؟"

"ہم دوسری زبانوں سے تراجم کرسکتے ہیں۔ لائق لوگوں سے نئی کتابیں لکھوا سکتے ہیں۔"

"اس میں تو بہت دیر لگ جائے گی۔"

"میں بھی یہ نہیں کہتا کہ یہ کام کل ہی ہوجائے گا۔ آپ ڈول تو ڈالیں' ابتدا تو کریں۔"

"اساتذہ کہاں سے لائیں گے؟"

"اساتذہ کو بے شک دہری محنت کرنی پڑے گی۔ ان کی تربیت کسی دوسری زبان کے ذریعے ہوئی ہے لیکن یہ وقت تھوڑے دن رہے گی۔ ان کے پڑھائے ہوئے طالب علم جب فارغ التحصیل ہوں گے تو ہمیں اساتذہ کی کمی قطعی محسوس نہیں ہوگی۔"

"اگر ابتدا میں کالج قائم کریں اور پھر یونیورسٹی تک پہنچیں؟" سر اکبر حیدری نے کہا۔

"یہ بھی ہوسکتا ہے بلکہ یہی ہونا چاہیے۔"

"محسن الملک ہیں۔ سر راس مسعود ہیں۔ ذرا ان لوگوں سے بھی مشورہ کرد یکھئے۔"

"میں ان حضرات سے بات کرچکا ہوں۔ انہیں بھی ابتدا میں کئی شبہات تھے لیکن میں سب رفع کرچکا۔ ویسے ان سے اور بات کرلی جائے گی۔ سرکاری منظوری کے بغیر یہ کام نہیں ہوسکتا اور یہ کام آپ ہی کرسکتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ میں حضور نظام کے روبرو یہ منصوبہ رکھ دوں گا۔ آگے ہماری قسمت۔"

"منصوبہ ان کے سامنے رکھنا نہیں ہے' سفارش کرنی ہے۔ میں انکار نہیں سن سکوں گا۔"

"مولوی صاحب' آپ ہیں بڑے ضدی۔ سمجھئے یہ کام ہوگیا۔"

ریاستی کاموں میں دیر تو لگتی ہے۔ بہت دن بیت گئے لیکن نتائج اچھے ہی نکلے۔ جامعہ عثمانیہ کی تیاری اور کتب کی فراہمی کے لیے ان ہی کے مشورے سے دارالترجمہ کا قیام عمل میں آگیا۔ ہندوستان بھر سے مشہور اہلِ قلم کو مدعو کیا گیا۔ ہندوستان بھر سے مشہور اہلِ قلم کو مدعو کیا گیا۔ مولوی صاحب اس کے ناظم مقرر ہوئے۔ جوش ملیح آبادی' جلیل مانک پوری' مرزا ہادی رسوا' فرحت اللہ بیگ اور ایسے ہی بہت سے دوسرے باکمال حیدر آباد میں آبسے۔

کتب کی فراہمی آسان کام نہیں تھا لیکن دو سال کی قلیل مدت میں نصابی کتابیں تیار ہوگئیں۔

جامعہ عثمانیہ کے افتتاح کے بعد ان کا کام ختم ہوگیا تھا لہٰذا وہ اورنگ آباد واپس چلے گئے۔ وہاں پہنچتے ہی انہیں عثمانیہ کالج کا پرنسپل مقرر کردیا گیا۔

انجمن کا کام بڑھتا جارہا تھا۔ لغت کی تیاری کے لیے بھی انہیں بہت سارا وقت پس انداز کرنا ہوتا تھا۔ ایسے میں ملازمت کا بار اس کے لیے سوہانِ روح بنا ہوا تھا لیکن اردو کی خدمت کے ساتھ ساتھ حکومت حیدر آباد بھی ان کی اہلیت سے فائدہ اٹھانا چاہتی تھی۔ اس لیے فراغت کی کوئی صورت نہیں تھی۔ اس نے کئی مرتبہ ملازمت کو خیرباد کہنے کا ارادہ کیا لیکن ہر مرتبہ کوئی نہ کوئی ہتھ کڑی ان کے ہاتھ میں ڈال دی گئی۔ بالآخر انہوں نے ۱۹۳۰ء میں پنشن لے لی۔ اب وہ آزاد تھے۔ اپنا تمام وقت انجمن کے سپرد کرسکتے تھے لیکن یہ آزادی زیادہ دن نہیں چل سکی۔ سر اکبر حیدری ایک مرتبہ پھر اس کے سامنے آگئے۔

"جامعہ عثمانیہ کو آپ کی ضرورت ہے۔"

"آپ دیکھ رہے ہیں حالات کیا رخ اختیار کررہے ہیں۔ اردو کو ہندو دشمنی کا سامنا ہے۔ مجھے اس کا دفاع کرنا ہے۔ اس کے لیے وقت درکار ہے۔ اس لیے میں نے ملازمت ترک کی ہے۔ آپ پھر مجھے اسی خارزار میں لے جانا چاہتے ہیں۔"

"میں آپ کو جہاں لے جانا چاہتا ہوں وہ آپ ہی کا لگایا ہوا پودا ہے۔ اس کی سیرابی بھی آپ ہی کی ذمّے داری ہے۔"

"اس کے لیے اب بہت سے لوگ ہیں لیکن جو کام میں کررہا ہوں' وہ میں ہی کرسکتا ہوں۔"

"میں نے کب کہا کہ آپ اپنا کام چھوڑدیں۔"

"بے شک آپ نے نہیں کہا لیکن میں بقیہ عمر اورنگ آباد میں گزارنا چاہتا ہوں۔ یہاں کی آب وہوا مجھے راس آگئی ہے۔"

"دیکھ لیجئے مولوی صاحب! ایک مرتبہ آپ نے مجھ سے کچھ کہا تھا۔ میں نے آپ کی بات فوراً مان لی تھی۔ اب آپ کی باری ہے۔ جامعہ عثمانیہ کا شعبۂ اردو ایک عدد صدر کا انتظار کررہا ہے اور وہ آپ ہیں۔"

اس کے بعد کوئی گنجائش نہیں رہ گئی تھی کہ وہ انکار کرتے۔ وہ صدرِ شعبہ اردو ہوکر حیدر آباد آگئے۔

○☆○

ہندی' اُردو کا جھگڑا سرسید کی زندگی ہی میں سر اٹھاچکا تھا۔ حالات بدلے تو اس جھگڑے نے ایک مرتبہ پھر سر اٹھایا۔ اب اس کے سیاسی مقاصد بھی تھے۔ واردھا اسکیم کے نام پر اردو اور اسلامی ثقافت کے خلاف سازشیں تیار کی جارہی تھیں۔ گاندھی جی کی حمایت اور اردو دشمنی نے عام ہندوؤں کو بہت پُرجوش بنادیا تھا۔ رسم الخط بدل دینے کی باتیں ہورہی تھیں۔ اردو کو محض مسلمانوں کی زبان سمجھ کرا سے مٹادینے کی باتیں ہورہی تھیں۔ مسلمانوں میں اس کا شدید ردِعمل تھا۔ چنگاریاں بھڑکنے کے لیے تیار تھیں۔ انہی دنوں عثمانیہ کالج میں کالج ڈے منایا گیا۔ عبدالحق نے اس موقع پر ایسی جذباتی اور دل سوز تقریر کی کہ طلبہ میں کھلبلی مچ گئی۔ ایک جوشیلے نوجوان یوسف نے نعرہ لگایا۔

"بابائے اردو' زندہ باد۔"

اس نعرے کے لگتے ہی ہزاروں آوازیں گونجنے لگیں۔

"بابائے اردو زندہ باد۔"

اس موقع کی خبر اورنگ آباد کے ایک ہفتہ وار میں شائع ہوئی' سرخی تھی۔

"بابائے اردو کا' کالج کے طلبہ سے خطاب۔"

اس خبر کا لگنا تھا کہ یہ خطاب پورے برصغیر میں پھیل گیا۔ اب وہ جہاں جاتے اسی نام سے پکارے جاتے۔

یہ خطاب محض جذباتی نعرہ نہیں تھا۔ عبدالحق اس کے بجا طور پر اہل تھے۔ دنیا کی کسی زبان کی تاریخ میں کوئی ایسی شخصیت پیدا نہیں ہوئی جس نے اپنی تمام زندگی زبان کی خاطر معرکہ آرائیوں میں گزاردی ہو۔ عبدالحق یہی کررہے تھے لہٰذا یہ لقب ان پر جچنے لگا۔ اب وہ بابائے اردو تھے۔ بڑوں کے لیے بھی چھوٹوں کے لیے بھی۔

۱۹۳۵ء میں اردو کے خلاف باقاعدہ مورچا قائم کیا گیا۔ بھارتیہ ساہتیہ پرشد اور ودیا مندر اسکیم کے تحت ہندی کو فروغ دینے کی مہم کا آغاز ہوا۔ یہ ایسی سازش تھی کہ اگر بروقت اس کے خلاف جوابی مورچا قائم نہ کیا جاتا تو اردو کا وجود ہی خطرے میں پڑجاتا۔ یہ مسئلہ نہ تو بظاہر سیاسی تھا نہ مذہبی اس لیے رہنمایانِ ہند خاموش تھے جبکہ گاندھی جی ان کوششوں میں برابر کے شریک ہو رہے تھے۔ گاندھی جی نے سیاست اور لسانیات کو ہم رشتہ کرنے کی کوشش کی تو سارا ملک دو حصوں میں تقسیم ہوگیا۔ ایک طرف اردو کے حامی تو دوسری جانب اردو کے طرف دار پیدا ہوگئے۔ ہندی کے طرف دار زیادہ طاقت ور تھے کیونکہ گاندھی جیسی بڑی شخصیت ان کی رہنمائی کررہی تھی۔

اب مولوی عبدالحق کی باری تھی۔ اب تک انہوں نے کرم خوردہ کتابوں پر نظریں جمائی ہوئی تھیں' اب ایک دوسری قسم کی جنگ سے سابقہ تھا۔ اب تک بے جان حروف ان کے سامنے تھے لیکن اب شعلے اگلتی ہوئی زبانوں سے واسطہ تھا۔ اب ملک گیر دورے کرکے اردو کی اہمیت کو ثابت کرنا تھا۔ انہیں یہ بتانا تھا کہ ہندوستان میں انگریزی راج کے استحکام کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ انگریزوں نے ہندوستانیوں کو انگریزی زبان میں تعلیم دے کر ان کی قومی اور تہذیبی خصوصیات کو ختم کردیا۔ اب یہی کھیل ہندو ہمارے ساتھ کھیلنا چاہتا ہے۔

انہوں نے کمرِ ہمت باندھی اور ایک ایک شہر میں جاکر اردو کی اہمیت پر تقریریں کیں۔

"کچھ لوگ یہ خیال کرتے ہیں جیسا کہ گاندھی وغیرہ نے فرمایا کہ اردو زبان مسلمان بادشاہوں نے پھیلائی اور حکومت کے زور سے پھیلی' وہ نہ صرف اس زبان کی تاریخ سے ناواقف ہیں بلکہ اصولِ لسانیات سے بھی ناآشنا ہیں۔ مسلمان بادشاہوں نے کبھی اس طرف توجہ نہیں کی۔ ان کی سرکاری اور درباری اور دفتری زبان آخر تک فارسی رہی۔"

"یہ امر خاص مسرت کا باعث ہے کہ تقریباً ہر صوبہ اس بات کا مدعی ہے کہ اردو زبان نے وہیں جنم لیا۔ اہلِ پنجاب کو یہ دعویٰ ہے کہ اردو کا بیج اس خطے میں اپجا' اہلِ دہلی کا خیال ہے کہ یہ دہلی اور اس کے قرب وجوار کی زبان تھی جو بن سنور کر اردو کہلائی۔ صوبہ متحدہ والے کہتے ہیں کہ میرٹھ اور اس کے پاس کے دیہات کی بولی پر فارسی کی قلم لگائی گئی اور اس سے اردو پیدا ہوئی۔ اہلِ گجرات کہتے ہیں یہ کچی دھات تھی۔ ہم نے اسے نکھارا' سنوارا اور بنایا۔ اہلِ دکن کا

"چند آرا"

"مولوی عبدالحق کا اصل کارنامہ لسانی حیثیت کا ہے۔ اردو کے قدیم تذکرے' دواوین اور نثر کی اہم کتابیں جو ناپید تھیں' وہ مولوی صاحب کی بدولت سامنے آئیں۔"

(ڈاکٹر خلیل الرحمن اعظمی)

"اردو کے محسنوں اور مخلص خادموں کی فہرست مختصر نہیں' اچھی خاصی طویل ہے۔ سیکڑوں ناموں سے متجاوز اور خدمات کے لحاظ سے ایک سے بڑھ کر ایک۔ پھر بھی اگر مجموعی طور پر کسی ایک کو محسن اعظم کا لقب دیا جاسکتا ہے تو وہ ذات بلا اختلاف بابائے اردو مولوی عبدالحق ہی کی ہوسکتی ہے۔"

(مولانا عبدالماجد دریابادی)

"ملک کے پورے طول وعرض میں' جس میں اردو زبان بولنے والوں کی تعداد کروڑوں سے بڑھی ہوئی ہے۔ اس کی خدمت کرنے والوں کی تعداد اگر مولوی عبدالحق نہ ہوتے تو صفر ہوتی۔ انہوں نے اردو کی تاریخ کئی سو سال آگے بڑھادی۔ ادب اور تاریخ ادب پر تحقیقی مضمون لکھے۔ اردو کے قواعد کو نئے سرے سے مرتب کیا۔ اردو لغت' اردو تذکرے اردو کے پرانے دیوان اور اردو میں نئے علوم کی عمدہ کتابیں چھپوائیں۔"

(سید سلیمان ندوی)

"مولوی عبدالحق کے کارنامے اس درجہ بلند' گراں مایہ اور پائیدار ہیں کہ آج پاک وہند کے آسمان کے نیچے کوئی دوسرا شخص علم وادب اور زبان کے دائرے میں ان کی ہم سری کا دعویٰ نہیں کرسکتا اور جس دور سے ہم گزر رہے ہیں' اس میں مولانا جیسے کسی دوسرے فرد کا پیدا ہونا بظاہر مشکل نظر آتا ہے۔"

(غلام رسول مہر)

"مولوی صاحب کی اردو نثر بہت حد تک سرسید اور حالی کے طرزِ تحریر کی نمائندگی کرتی ہے۔ ان دونوں بزرگوں کی طرح وہ بھی سادگی اور سلاست کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔ ان کی نثر میں ایک خاص قسم کی پختگی پائی جاتی ہے۔ جس میں دلی کی ٹکسالی زبان کا خاص طور سے رنگ جھلکتا ہے۔"

(ڈاکٹر ابوسعید نورالدین)

دعویٰ ہے کہ اس زبان نے ادبی شان یہاں پیدا کی۔ بہار والے چاہیں تو وہ بھی دکن کی طرح اس بات کا دعویٰ کرسکتے ہیں۔ اس سے اردو کی مقبولیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے اور قبول عام ہی سب سے قوی دلیل اور سب سے بڑی پسند ہے۔"

"قومیت کے لیے' یک رنگی کے لیے ہم خیالی کی اور ہم خیالی کے لیے ہم لسانی کی سخت ضرورت ہے۔ جہاں زبان ایک نہیں وہاں خیال کا رنگ ایک نہیں۔ جہاں خیال ایک نہیں وہاں دل بھی ایک نہیں۔ یہ دلوں کو جوڑتی ہے اور بے گانوں کو یگانہ بنادیتی ہے۔ اردو نے بہ درجۂ کمال یہ خدمت انجام دی ہے۔"

مولوی صاحب نے اپنی تقریروں کے ذریعے اردو کی فضیلت کو ثابت کیا۔ متنازع مسائل کو اس خوبی سے سلجھایا کہ دودھ اور پانی الگ الگ نظر آنے لگا۔ انہوں نے یہ پیغام گھر گھر پہنچادیا کہ اردو ایک مخلوط زبان ہے۔ اس پر ہر قوم کا برابر کا حق ہے لیکن بعض لوگ محض مسلمان دشمنی میں اردو کی مخالفت کرکے ہندی کا ڈھونگ رچارہے ہیں۔

ان تقریروں سے مخالف صفوں میں ہلچل مچ گئی۔ نتیجے کے طور پر انہوں نے بھی اپنی کوششیں تیز کردیں۔ اسی حساب سے عبدالحق کو بھی پینترے بدل بدل کر حملے کرنے پڑے۔

انجمن کی جب بنیاد رکھی گئی تھی تو اس کا مقصد ادبی اور علمی قرار دیا گیا تھا۔ یعنی ترجمے' ترتیب و تالیف کے ذریعے اردو زبان کے ادبی و علمی سرمائے میں اضافہ کرنا۔ اس مقصد کی پابندی کی جارہی تھی۔ کبھی ہندی یا کسی دوسری زبان کی مخالفت نہیں کی گئی لیکن جب اردو کی ترقی مخالفوں کو ایک آنکھ نہیں بھائی اور اس کی راہ میں روڑے اٹکائے جانے لگے تو مجبوراً مدافعت کرنی پڑی۔ اردو کی محبت میں وہ بڑی سے بڑی طاقت سے ٹکراگئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ترقی اردو کی تحریک آگ کی طرح پھیل گئی۔ بنگال' بہار' یوپی' سندھ' کشمیر' گوالیار' رانچی' جنوبی بہار' مدراس' آندھرا' ارکاٹ' ملیبار' تامل ناڈو' ٹرانکور تک اپنے خطبات اور تقریروں کا جال پھیلادیا اور راس کماری تک جاکردم لیا۔ لوگ محاورے کے طور پر کشمیر تا راس کماری تک کا فقرہ کہا کرتے تھے' عبدالحق نے اسے حقیقت کردکھایا۔

○☆○

اختر حسین رائے پوری کی شادی کا سلسلہ چل نکلا تھا۔ وہ اپنے طور پر لڑکی کے والد کو خط لکھ چکے تھے۔ لڑکا خود پیغام بھیجے۔ یہ عجیب سی بات ضرور تھی لیکن جرأت مندانہ تھی۔ لڑکی کے والد نے اس جرأت کو پسند ضرور کیا لیکن صاحب زادے کس خاندان سے ہیں' کیسے ہیں یہ بھی تو معلوم ہو۔ جب معلوم ہوا کہ موصوف عبدالحق کے ساتھ کام کرتے ہیں۔ وہیں رہتے ہیں۔ وہی ان کے سب کچھ ہیں تو انہوں نے بھی ایک خط مولوی عبدالحق کے نام لکھ دیا۔

کچھ دن بعد مولوی صاحب کا خط لڑکی کے والد کو موصول ہوا۔ جس کا خلاصہ کچھ یوں تھا۔

"ان تمام نوجوانوں میں جن سے زندگی بھر میرا سابقہ رہا' ان میں یہ قابل ترین ہیں۔ یہ صرف انگریزی اور اردو ہی کے اچھے عالم نہیں بلکہ سنسکرت' ہندی' بنگلہ اور گجراتی زبانوں کا بھی علم رکھتے ہیں۔ انتہائی مہذب' شائستہ اور روشن خیال ہیں۔ فی الحال وہ میرے ساتھ اردو لغت کے کام میں مصروف ہیں۔

میں ان کے خاندان کے متعلق صرف اتنا جانتا ہوں کہ والد سے کوئی تعلق نہیں مگر اس میں ان کا اپنا کوئی قصور نہیں بلکہ سوتیلی والدہ کا ہاتھ ہے۔

میری رائے تو یہ ہے کہ آپ کو اس معاملے میں کوئی تامل نہیں ہونا چاہیے۔"

○☆○

لڑکی کے والد نے واقعی کوئی تامل نہیں کیا۔ بابائے اردو کی گواہی بہت تھی۔ انہوں نے پہلی فرصت میں رضامندی کا خط لکھ دیا۔

مزید خطوں کے تبادلے کے بعد شادی کی تاریخ ۲۹ دسمبر ۳۵ء قرار پائی۔

اس شادی کی خبر سنتے ہی مولوی صاحب کا ایک نیا روپ سامنے آیا۔ عموماً انہیں جھگڑالو اور غصہ ور سمجھا جاتا تھا لیکن جب اختر رائے پوری کی برات لے کر علی گڑھ گئے تو اسٹیشن پر اترتے ہی اختر کے دوستوں کے ساتھ مل کر ان کی تک بندیوں کے ہم نوا ہوگئے۔

للا روپیہ لائیو ہے
للا کی شادی کردیں گے
کردیں بھئی کردیں گے

مجاز کی شوخیاں مشہور تھیں۔ ممکن ہے مولوی صاحب ان شوخیوں کو پسند بھی نہ کرتے ہوں لیکن اس وقت وہ متانت بھول کر لڑکوں میں لڑکے بنے ہوئے تھے۔

دلہن کے گھر پہنچے تو براتیوں کے لیے خیمے لگے ہوئے تھے۔ سب کے خیمے الگ الگ تھے۔ قریب ہی امرود کا باغ

تھا۔ غالباً یہ مجاز ہی کی شرارت ہوگی کہ خیموں میں ٹھہرنے کے بجائے امرود کے باغ میں بسیرا کیا۔ مولوی صاحب یہاں بھی ان کے ساتھ ساتھ۔ سب نے طرح طرح کے بول گھڑ کر گانا شروع کردیا اور مولوی صاحب انہیں ڈانٹنے کے بجائے ہنس ہنس کر دہرے ہوئے جارہے تھے۔ آخر ڈھونڈ پڑی کہ براتی کہاں گئے۔ گانے کی آواز سے معلوم ہوا کہ براتی تو باغ میں ہیں۔ انہیں وہاں سے بلایا گیا کہ مہمانوں سے ملاقات تو ہوجائے۔

ایک بجے کہا گیا کہ کھانے کے کمرے میں تشریف لے چلیں۔ کھانے کا کمرا بہت بڑا تھا۔ چوبیس آدمیوں کی میز لگی ہوئی تھی۔ بیرے سفید وردی اور اونچی کلاہ میں کھانے کی ڈشیں پیش کرنے لگے۔ سرخ وردی میں بینڈ والے منتظر کھڑے تھے کہ کھانا شروع ہو تو وہ دھن چھیڑیں۔ جیسے ہی مہمانوں نے کھانا پلیٹوں میں نکالا نفیری بجنے لگی۔ مولوی صاحب کو پھر شرارت سوجھی۔

"بھئی، اس توں توں پی پی میں کھایا تو کچھ جائے گا نہیں تو چلو پی ہی لیں" یہ کہہ کر سامنے رکھی ٹماٹر ساس کی بوتل کھول کر غٹ غٹ پینے لگے۔ ان کو دیکھ کر ان کے ساتھ آئے ہوئے دوستوں نے بھی یہی کیا۔ آخر بینڈ والوں کو باہر بھیجا گیا تب جاکر انہوں نے کھانا شروع کیا۔

یہ معلوم ہوتا تھا جیسے مولوی صاحب تھوڑی دیر کے لیے بچے بن گئے ہیں۔ یہ ان کی خوشی کی انتہا تھی۔ اس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے ساتھ کام کرنے والوں کا کتنا خیال رکھتے ہیں اور ان کی خوشیوں میں کس طرح شریک ہوتے ہیں۔

مغرب کے بعد نکاح تھا۔ نکاح کے دوران میں بھی وہ اسی طرح شرارتیں کرتے رہے۔ آخر اللہ اللہ کرکے ایجاب و قبول کا مرحلہ طے ہوا۔

"میں ایک سہرا لکھ کر لایا ہوں۔ پیشِ خدمت ہے" کسی صاحب نے کھڑے ہو کر کہا۔

"سہرا آپ کس خوشی میں پڑھیں گے" مولوی صاحب نے اپنی کراری آواز میں کہا "خوش ہونے کے حق دار ہم ہیں کہ دلہن لے جارہے ہیں۔ ہم سہرا خود لکھ کر لائے ہیں" انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے مجاز اور ساغر نظامی کو اپنے پاس بلالیا۔ سب ایک ساتھ کھڑے ہوگئے اور سہرا گانا شروع کردیا مولوی صاحب تال دیتے جارہے تھے۔

اک بنجارا یار ہمارا
پھرتا تھا یوں مارا مارا
جیسے ہو اک مرغ بے چارا
ڈھونڈے سہارا دڑبے کا
یہ کیا تم نے دل میں ٹھانی
لکھ ڈالی سب رام کہانی
مندر کی مندر کی
بہن کھلونا بھائی تماشا
آگے تانگا پیچھے گھوڑا
خاکی وردی ہاتھ میں ڈنڈا
تن کے چلے ہے دلہن کا باوا

یہ سب بابائے اردو کی تک بندی تھی۔ کوئی تصور بھی نہیں کرسکتا تھا کہ ایسا متین بوڑھا، سب کے ہنسنے کا ایسا سامان کرے گا۔ اپنے رعب اپنے وقار تک کو داؤ پر لگادے گا۔

یہ ہنسی نہیں تھی، ان کے اندر چھپے ہوئے وہ ارمان تھے جو وہ اردو کو پالنے پوسنے میں فراموش کرچکے تھے۔ وہ ایک شادی سے بھاگ چکے تھے لیکن کہیں اور شادی کرسکتے تھے لیکن انہوں نے تو انجمن سے شادی کرلی تھی۔ اسی کو تکیہ بنائے بیٹھے تھے۔ اب جو ایک موقع ملا تو مولوی صاحب پھٹ پڑے۔ انہیں بزرگ بنا کر لایا گیا تھا لیکن ان کے اندر چھپا ہوا لڑکا ان کے ساتھ آگیا تھا۔

ان کا ڈنکا اس وقت پورے ہندوستان میں بجتا تھا۔ ہر طرف ان کی شہرت پھیلی ہوئی تھی۔ رعب و دبدبہ طاری تھا لیکن اس وقت وہ بالکل بچے بنے ہوئے تھے۔ ہائے انسان کو اس کی مصروفیات اور اس کے عہدے کا بھرم کیا سے کیا بنادیتا ہے کہ ہنسنے کے لیے بھی اسے وقت نہیں ملتا اور جب ہنستا ہے تو لوگ اسے اس طرح دیکھتے ہیں جیسے کوئی عجوبہ۔ یہ نہیں دیکھتے کہ بال سفید ہیں تو کیا ہوا، روشن آنکھوں میں شفقت کے دیے تو جل رہے ہیں۔

کئی دن کی مہمان داری کے بعد حیدرآباد کے لیے روانگی کا وقت آگیا۔ اسٹیشن پہنچے۔ ریل آکر رکی۔ چار سیٹر ایک ڈبا بک کرایا گیا تھا لیکن جب اندر گئے تو یہ چھ سیٹر نکلا۔ ایک بنگالی جوڑا اپنے دو عدد بچوں کے ساتھ پہلے ہی سے براجمان تھا۔ یہ دیکھ کر مولوی صاحب کا پارا چڑھ گیا۔

"یہ ہاشمی فرید آبادی بھی فضول سے آدمی ہیں۔ بکنگ ان کے ذمّے کی تھی۔ حضرت نے یہ بکنگ کرائی ہے۔"

ہاشمی صاحب نے بکنگ کرائی تھی لہٰذا انہی پر غصہ اتارا جارہا تھا۔ بہرحال اب کیا ہوسکتا تھا سامان رکھ دیا گیا۔

تین سیٹیں نیچے کی ان کے پاس تھیں۔ چوتھے پر وہ دو

بنگالی بچے اور اوپر کی دو سیٹوں پر دونوں میاں بیوی۔
ریل اسپیڈ پکڑ چکی تھی' اچانک حمیدہ (دلہن) کو یہ احساس ہوا کہ وہ اپنے میکے سے کتنی دور جا رہی ہے۔ ضبط کا بندھن ٹوٹ گیا۔ وہ کھڑکی سے سر باہر نکال کر رونے لگی۔ مولوی صاحب کی مشفق آنکھوں سے یہ منظر چھپا نہ رہ سکا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھے اور حمیدہ کے پاس آکر کھڑے ہوگئے۔
"سنو! ہم کو سمندر' دریا اور جھرنوں کا پانی بہت اچھا لگتا ہے مگر یہ آنکھوں کا بہتا پانی قطعی پسند نہیں۔ سر اندر کرو اور اپنے ڈبے کی آب و ہوا اور دیگر ہم سفروں پر غور کرو۔ اب ہمیں ان سے نمٹنا ہے۔"
وہ بے چاری کچھ بھی نہیں سمجھ سکی کہ نمٹنے سے کیا مطلب ہے۔ کیا جھگڑا کریں گے؟ اس نے آنسو پونچھے اور سر اندر کرلیا۔ مولوی صاحب نے چپکے سے اختر کے کان میں کچھ کہا اور دونوں ہنسنے لگے۔ اس کے بعد مولوی صاحب اپنی سیٹ پر آکر بیٹھ گئے۔ اچانک دونوں بچوں کی زوردار چیخیں نکلیں۔ اوپر سے بچوں کے باپ نے بنگالی میں کچھ پوچھا۔ بچوں نے بنگالی ہی میں جواب دیا اور ساتھ ہی مولوی صاحب کی طرف اشارہ کیا۔ مولوی صاحب مزے سے اخبار پڑھ رہے تھے۔ کچھ دیر بعد بچے پھر زور سے پیخے۔ اس مرتبہ وہ اختر کی طرف اشارہ کررہے تھے۔ حمیدہ نے دیکھا' وہ دونوں ہاتھ کی چونچ بنائے' منہ ٹیڑھا ترچھا کرکے بچوں کو ڈرا رہے تھے۔ حمیدہ حیران تھی کہ وہ ایسا کیوں کررہے ہیں؟
"بڑا شاب! آپ کیا کرتا ہے۔ بچوں کو کیوں ڈراتا ہے۔ کیا آپ پاگل آدمی ہے؟" اوپر سے اس بنگالی نے پوچھا۔
"اور کیا۔ باہر ڈبے پر لکھا نہیں دیکھا کہ اس ڈبے میں دو پاگل بھی سفر کریں گے" مولوی صاحب نے کہا اور اب وہ بچوں کے بجائے ماں' باپ کو ڈرانے لگے۔ اس کے ساتھ ہی اختر اور مولوی صاحب ہولناک آوازیں بھی نکالنے لگے۔
وہ بنگالی جوڑا جھٹ نیچے اترا' دونوں بچوں کو سینے سے لگایا' سامان سمیٹا اور دروازے کے پاس جاکر بیٹھ گئے۔
ریل رکی۔ وہ دونوں دروازہ کھول کھٹاک سے' بچوں کو لے کر اتر گئے۔
اختر اور مولوی صاحب بچوں کی طرح ہنس رہے تھے۔ اب حمیدہ کی سمجھ میں آیا ورنہ وہ تو خود انہیں پاگل سمجھنے لگی تھی۔
ڈبا خالی ہوتے ہی مولوی صاحب کو اپنا حقہ یاد آگیا۔ تمباکو کی خوشبو پورے ڈبے میں پھیل گئی۔
بڑے چاؤ سے بیاہ کرلائے۔ بزرگوں کی طرح کوٹھی کا ایک ایک کمرا دکھایا۔ اپنے ہاتھ سے چائے بنا کر پلائی۔ گھر کی بڑی بوڑھیوں کی طرح چابیاں بہو کے ہاتھوں میں تھمادیں۔
"سب نوکروں کی تنخواہیں دینا اور بشیر کو کھانا پکانے کو بتادیا کرنا۔"
انہوں نے اپنی دانست میں گھرداری نئی آنے والی کے سپرد کردی اور اپنے کام میں مصروف ہوگئے۔
کام کے وقت کام' کھیل کے وقت کھیل۔ یہ اصول ان کا ہمیشہ سے تھا۔ نئی آنے والی سے پہلے کھیل کے وقت بھی کام ہی ہوتا تھا لیکن اب انہیں یہ احساس بھی تھا کہ حمیدہ دن بھر کے سناٹے سے بور ہوجاتی ہوگی لٰہذا کچھ کھیل بھی ہونا چاہیے۔ ایک دن جو آئے تو تین بڑے چھوٹے بنڈل ہاتھوں میں۔ ایک میں تین عدد بیڈ منٹن کے بلے' ایک میں دو گڈی تاش اور ایک میں پچیسی کی بساط اور کوڑیاں۔
"یہ بیڈ منٹن تین آدمی کیسے کھیل سکتے ہیں؟ ہاں تاش کھیلے جاسکتے ہیں" حمیدہ نے کہا۔
"لیکن ہمیں تو تاش آتے نہیں۔ چلو تم مجھے اور اختر کو سکھاؤ۔"
"کیا آپ دونوں تاش کھیلنا نہیں جانتے؟"
"جن کے پاس فاضل وقت ہوتا ہے وہی ایسے کھیل کھیلا کرتے ہیں۔"
بہرحال عقل و فکر کی یہاں کیا کمی تھی۔ چند ہی ہاتھ کھیلے ہوں گے کہ کھیل پر حاوی ہوگئے۔ جتنا کھیلا گیا' کھیلے پھر دامن جھاڑ کر کھڑے ہوگئے۔
"بھئی' ایک بات کا خیال رہے۔ کسی کے سامنے بھول کر بھی مت کہہ بیٹھنا ورنہ پورے شہر میں مشہور ہوجائے گا کہ مولوی عبدالحق تاش کھیلتے ہیں۔"
حمیدہ کے آجانے کے بعد رات کا مطالعہ ہی موقوف ہوگیا تھا۔ غصہ یہاں بھی اپنا کام دکھارہا تھا۔ کھیل کھیل میں ایسے غصے میں آتے کہ روز تاش کی ایک گڈی پُرزوں میں تبدیل ہوجاتی۔
حمیدہ کی ایک ایک ضرورت کا خیال رکھتے۔ جو وعدہ کرتے اسے پابندی سے پورا کرتے جیسے پوری عمر گھرداری میں گزری ہے۔
ایک مرتبہ حمیدہ اختر سے کسی بات پر خوش ہوئے۔ ناشتے کے بعد اپنے کمرے کی کیبنٹ سے ایک ڈبیا نکال کر لائے۔ پرانی ہوگئی تھی لیکن پھر بھی نہایت خوب صورت لگ رہی تھی۔
حمیدہ نے اسے کھولا تو اس میں بارہ عدد مٹر کے دانوں

کے برابر سچے آب دار موتی تھے۔
"سچ سچ بتائیے۔ آپ نے کس کے لیے یہ ڈبیا اور موتی لیے تھے؟" حمیدہ نے انہیں چھیڑنے کے لیے پوچھا۔
"تم نے یہ کیوں پوچھا؟" ان کی آنکھوں میں اداسی صاف دکھائی دے رہی تھی۔
"ڈبیا بہت پرانی جو ہے۔"
"تم نے سچ کہا۔ کسی کو دینے کے لیے بہت عرصہ پہلے لیے تھے، لیکن دیے نہیں۔"
"کیوں؟"
"اس کو اس قابل نہ سمجھا۔ جب سے یہ ڈبیا یونہی پڑی رہی۔ کچھ خیال ہی نہیں آیا۔"
انہیں انجمن کے عشق میں بہت سی باتوں کا خیال نہیں آسکا تھا اور زندگی گزرتی جارہی تھی۔
اس ڈبیا نے شاید ان کا کوئی زخم تازہ کردیا تھا کیونکہ اس روز وہ شام کی سیر کو بھی نہیں گئے۔ ان کے معمول میں فرق آجائے۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔
۱۹۳۵ء ہی کا سال تھا کہ کنہیا لال منشی (غذائی وزیر) مولوی عبدالحق سے ملنے حیدر آباد آئے۔
"مولوی صاحب! زبانوں کا جھگڑا بہت ہوچکا۔ اب کوئی ایسی صورت ہونی چاہیے کہ سب مل کر بیٹھ جائیں۔" کنہیا لال نے باتوں باتوں میں کہا۔
"میں تو ہمیشہ سے کہتا آیا ہوں کہ زبانوں کے مسئلے جھگڑوں سے طے نہیں ہوتے۔ زبانیں تو محبتوں کی سفیر ہوتی ہیں" عبدالحق نے کہا۔
"بھگوان آپ کا بھلا کرے۔ بس اسی لیے میں آپ کے پاس حاضر ہوا ہوں۔ ہم ایک ایسی انجمن بنانا چاہتے ہیں جس میں ہر زبان کے ادیب شریک ہوں تاکہ ایک دوسرے کے ادب کے حالات اور معلومات سے واقف ہوسکیں۔"
"بڑا اچھا خیال ہے آپ کا۔ اس طرح ساری غلط فہمیاں دور ہوجائیں گی۔ ویسے ایک بات بتادوں کنہیا لال جی۔ یہ جھگڑا ادیبوں کا ہے بھی نہیں۔ سب ایک دوسرے کے ادب کا احترام کرتے ہیں۔ یہ تو اب سیاسی مسئلہ بن گیا ہے۔"
"برابر کہا آپ نے۔ اسی لیے ہم نے سوچا ہے کہ اس کے سالانہ جلسے میں صدارت گاندھی جی کی رکھیں گے۔ دیکھیں وہ کیا کہتے ہیں؟"
"چلیے، یہ بھی کر دیکھیے۔"
"آپ کے پاس میں اس لیے آیا ہوں کہ آپ اس کی ورکنگ کمیٹی کے ممبر بن جائیے۔"
"میری جان کو ویسے ہی بہت آزار لگے ہوئے ہیں۔"
"یہ ایک ادبی معاملہ ہے اور پھر آپ کی موجودگی میں جو چیز طے ہوگئی اسے سب مسلمان مان لیں گے اس لیے آپ کا ہونا ضروری ہے۔"
"لیکن یہ بھی تو سوچئے کہ میں جس بات کو نہیں مانوں گا پھر آپ کتنا ہی زور لگائیں، کوئی نہیں مانے گا۔"
کنہیا لال یہ سن کر خفیف سی ہنسی ہنسنے لگے۔ عبدالحق نے اس کا رکن بننا منظور کرلیا۔
وہ کنہیا لال کو رخصت کرکے واپس آئے تو اچھے خاصے پریشان نظر آرہے تھے۔ ان کی پریشانی کا اظہار اس سے ہو رہا تھا کہ کوٹھی سے پھاٹک تک جانے والی سڑک پر بے قراری سے ٹہل رہے تھے۔
"آپ کے مہمان تو رخصت ہوگئے۔ اب آپ کو کس کا انتظار ہے" ان کے ایک دوست نے ان سے پوچھا جو ابھی ابھی ان سے ملنے آئے تھے۔
"آنے والے وقت کا انتظار ہے۔"
"میں سمجھا نہیں۔"
"اردو کے خلاف ایک اور سازش کی جارہی ہے۔ نام یہ ہے کہ ہر زبان کے ادیب مل کر بیٹھیں گے لیکن دراصل یہ ہمیں رام کرنے اور الجھانے کی ایک ترکیب ہے۔ گاندھی بڑا عیار ہے بالکل لومڑی کی طرح۔ اس انجمن کے ذریعے یہ بتایا جائے گا کہ اردو کی طرح ہر زبان کا ادب اہم ہے۔ سب برابر ہیں۔ بھئی، کسی کا اردو سے کیا مقابلہ۔ خیر دیکھا جائے گا۔"
تھوڑی ہی دیر میں ان کی پریشانی دور ہوگئی۔ وہ پہلے کی طرح نارمل ہوگئے لیکن اتنا غصہ پھر بھی رہا کہ آتے ہی دفتر والوں پر برس پڑے۔
"بس بہت وقت ضائع ہوچکا ہے۔ کام کی پوری پابندی ہونی چاہیے۔ جس بات کے اوقات ہیں اس میں فرق نہ آئے۔"

○☆○

اس نئی انجمن کا نام اکھل بھارتیہ ساہتیہ پرشد تھا۔ نام ہی سے ظاہر ہوتا تھا کہ یہ کن لوگوں کی انجمن ہے اور اس کے کیا عزائم ہوسکتے ہیں۔ اس انجمن نے اپنا اجلاس ناگپور میں منعقد کیا۔ وہ چونکہ ورکنگ کمیٹی کا ممبر تھا لہٰذا وہ بھی اس میں شریک ہوا۔
گاندھی جی اپنی مخصوص وضع قطع میں لپٹے لپٹائے

صدارت کی کرسی پر رونق افروز ہوئے۔ عبدالحق کو گاندھی سے کسی بھلائی کی توقع نہیں تھی۔ وہ ۱۸۶۷ء سے ہندی کو پھیلانے کی کوششیں کررہے تھے۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ جب تک مسلمانوں کے تمدن کی سب سے بڑی علامت اردو کو ختم نہیں کیا جائے گا' قدیم ویدک تمدن کا فروغ پانا مشکل ہے۔ سرسید کی زندگی سے لے کر اب تک یہ مسئلہ کل ہندسیاسی مسئلہ بن چکا تھا۔ اس کا مظاہرہ اس اجلاس میں بھی ہورہا تھا۔

انجمن کا نام چونکہ ''اکھل بھارتیہ پرشد تھا'' اس لیے اجلاس میں سب سے پہلے تو یہی مسئلہ اٹھا کہ ''پرشد'' کی زبان کیا ہوگی؟

مختلف تجویزیں سامنے آئیں۔ پھر گاندھی جی نے کہا۔

''مولوی جی سے پوچھو۔ یہی اردو کے بہت بڑے نیتا ہیں۔''

''اس میں سوچنے کی کیا بات ہے۔ ہندوستانی ہوگی'' مولوی عبدالحق نے اردو کا نام براہِ راست لینے کے بجائے کہا۔

''آپ ہندوستانی کیوں تجویز کرتے ہیں؟'' گاندھی جی نے پوچھا۔

''اس لیے کہ کانگریس کا یہ ریزولوشن ہے کہ کانگریس کی اور ملک کی زبان ہندوستانی ہوگی۔ نیز کانگریس کے آئین کی دفعہ ۲۱ میں صاف طور پر یہی درج ہے۔''

''اس کا مطلب یہ نہیں ہے'' گاندھی نے لاجواب ہوتے ہوئے پینترا بدلا۔

''آپ کے نزدیک کیا مطلب ہے؟''

''ہندی!'' گاندھی نے دوٹوک الفاظ میں کہا۔

''ہر دس سال کے بعد مطلب بدلتا گیا تو کام کیسے چلے گا۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ ہندوستانی کا مطلب وہ زبان جو پورے ہندوستان میں بولی اور سمجھی جاتی ہو۔ اور وہ اردو ہے۔ اس کو ہم نئے نام ہندوستانی سے بھی پکار سکتے ہیں۔''

''آپ جو بھی مطلب لیں۔ میں اس کا مطلب ہندی لیتا ہوں۔''

''اس طرح تو آپ ہندی کو اردو کے مقابل کھڑا کردینا چاہتے ہیں جو جھگڑے کا باعث بنے گا۔''

''جھگڑے کی بات ہی نہیں ہے۔ ہندوستان میں ہندی چلے گی۔''

''ہندوستانی بھی چل سکتی ہے۔''

''تو پھر یوں کیے لیتے ہیں کہ اس کا نام ہندی ہندوستانی رکھے دیتے ہیں۔''

''اچھا یہ بتائیے' ہندی سے آپ کی کیا مراد ہے؟'' عبدالحق نے پوچھا۔

''وہ زبان جو کتابوں میں ہے بول چال میں نہیں۔''

''بہت خوب! اور ہندوستانی سے آپ کا کیا مطلب ہے؟''

''وہ زبان جو بول چال میں ہے کتابوں میں نہیں۔''

''تو پھر ہندی ہندوستانی زبان کیا ہوئی؟''

''وہ زبان جو آگے چل کر ہندوستانی ہوجائے گی۔'' گاندھی نے کہا۔

''جب ہندوستانی پہلے سے موجود ہے تو پھر پچاس سال اور انتظار کرنے کی کیا ضرورت ہے؟''

اس سوال پر گاندھی جھنجلا گئے ''میں ہندوستانی نہیں چھوڑ سکتا'' انہوں نے نہایت غصے سے کہا۔

''جب آپ ہندی نہیں چھوڑ سکتے تو ہم اردو کیوں چھوڑ دیں؟''

''مسلمان چاہیں تو اردو رکھ لیں'' گاندھی نے کہا ''یہ ان کی مذہبی زبان ہے۔ قرآن کے حرفوں میں لکھی جاتی ہے۔ مسلمان بادشاہوں نے پھیلائی۔''

بحث اتنی تلخ ہوگئی تھی کہ تمام ارکان حیرت سے عبدالحق کا منہ تک رہے تھے۔ گاندھی سے ٹکرانے کا حوصلہ بڑے بڑے لیڈروں کو نہیں تھا اور عبدالحق کے تیور یہ بتا رہے تھے کہ ابھی تو کچھ نہیں ٹکرانے کا مرحلہ تو آئے گا۔

''آخر آپ چاہتے کیا ہیں؟ کیا یہ چاہتے ہیں کہ ہر مسلمان یہ لکھ کر دے دے کہ میری زبان ہندی ہوگی' میرا رسم الخط ناگری۔ میں اپنی زبان اور کلچر کا کبھی مطالبہ نہیں کروں گا۔''

''ہم کچھ نہیں چاہتے لیکن پرشد کی زبان ہندی ہندوستانی ہوگی۔''

''یہ انجمن اس لیے بنائی گئی تھی کہ ہر زبان کے ادیب مل کر بیٹھیں گے لیکن ہندوستان کی سب سے بڑی زبان کے خلاف زہر اگلا جارہا ہے' لہٰذا میں استعفیٰ دیتا ہوں۔''

ان کا یہ استعفیٰ محض ساہتیہ پرشد سے علیحدگی نہیں تھی بلکہ گاندھی سے نبرد آزما ہونے کا اعلان تھا۔ اس اعلان کی گونج بڑی دور تک سنائی دی۔

ہندی ہندوستانی کا نعرہ چل نکلا تھا۔ اردو کو صرف مسلمانوں کی زبان کہہ کر گاندھی نے نفرت کا بیج بودیا تھا۔ جہاں جہاں کانگریسی حکومتیں تھیں' اردو کی مخالفت سرکاری سطح پر کی جارہی تھی۔ اس نئی صورتِ حال پر غور کرنے کے لیے علی گڑھ میں ایک کل ہند اردو کانفرنس منعقد کی گئی۔ اس

کانفرنس میں دوسرے مسئلوں کے علاوہ ایک مسئلہ یہ قابلِ غور تھا کہ انجمن کا مرکزی دفتر کہاں قائم کیا جائے؟ کیونکہ حیدر آباد میں رہ کر اردو کی مدافعانہ جنگ نہیں لڑی جاسکتی تھی۔ آخر یہ طے پایا کہ دہلی موزوں ترین مقام ہے۔

○☆○

"مولوی صاحب، آپ کی طرف سے بڑے پریشان ہیں۔ ان کو ایسا لگ رہا ہے جیسے آپ پریشان ہیں" ایک دن حمیدہ نے اپنے شوہر اختر حسین رائے پوری سے پوچھا۔

"پریشان اس لیے ہوں کہ انہیں کیسے بتاؤں۔ میں دہلی جاکر اپنا اخبار نکالنا چاہتا ہوں اور مجھے خبر ہے وہ اجازت نہیں دیں گے۔ ان کی تنہائی کا خیال بھی آتا ہے۔ ہمارے جانے کے بعد وہ بالکل اکیلے رہ جائیں گے۔"

"پہلے بھی تو۔۔۔"

"اس وقت کی بات اور تھی۔ تمہارے آنے کے بعد وہ بہت مگن رہنے لگے ہیں۔"

"یہ آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔ پہلے میں بات کروں گی۔ ان کو جو ایک دھکا سا لگے گا اور غصہ بھی آئے گا۔ اس کو آپ نہ دیکھ سکیں گے۔ پھر دو ایک روز بعد آپ بات کر لیجیے گا۔"

"ہاں، یہ ٹھیک ہے۔"

اختر مطمئن ہوگیا۔ حمیدہ نے وعدے کے مطابق مولوی صاحب سے ذکر چھیڑ دیا۔

"ہمارے دہلی جانے سے آپ کو رنج ہوگا۔ اختر اس لیے پریشان ہیں۔"

"میرے رنجیدہ ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں تو خود انجمن کو دہلی منتقل کرنے کے مراحل میں ہوں۔ ساری کارروائیاں ہوجائیں پھر تینوں ساتھ چلیں گے۔"

"آپ کو تو ابھی سال سوا سال لگ جائے گا۔ اتنے عرصے میں ہم اخبار جمالیں گے۔ پھر آپ کے پاس ہوں گے۔"

"اور اتنے عرصے میں یہاں کیا جھک مارتا رہوں گا" انہوں نے جھلا کر کہا۔

ان کی محبت تھی جو اختر اور حمیدہ کو یہاں سے جانے نہیں دے رہی تھی لیکن بالآخر نم آنکھوں کے ساتھ انہیں اجازت دینی پڑی۔

○☆○

کُل ہند اردو کانفرنس منعقدہ علی گڑھ کے فیصلے کے مطابق انجمن کے دفتر کو دہلی منتقل کرنا تھا۔ اس مقصد کے لیے نئی دہلی کی ایک کوٹھی القریش کرائے پر لی گئی اور پھر چند ماہ بعد ہی ڈاکٹر انصاری کی کوٹھی (نمبر ایک دریا گنج) کرائے پر لے لی گئی۔

اس دوران میں کانگریس کی عبوری وزارتوں نے اپنے عمل سے اردو کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچانا شروع کردیا۔ کانگریسی رہنماؤں نے اردو کی مخالفت بہار سے شروع کی تھی لیکن سی پی کی زمین اردو، ہندی، تنازعے کا مرکز بن گئی۔ سی پی میں کانگریسی عبوری حکومت نے ودیا مندر اسکیم کا زبردستی نفاذ چاہا۔ عبدالحق نے شدید مخالفت کی۔ فوری طور پر اپنے دست راست حکیم اسرار کی قیادت میں ناگپور سیکریٹریٹ میں ایک وفد روانہ کیا۔ اس وفد کے مندرجہ ذیل مطالبات تھے۔

۱۔ ودیا مندر کا نام تبدیل کیا جائے۔ اگر نام رکھنا ہی چاہتے ہیں تو پڑھائی گھر رکھ لیں۔

۲۔ مسلمان بچوں کے لیے اردو تعلیم کا انتظام۔

۳۔ سی پی میں جو کتابیں رائج ہیں ان میں ہندو سورماؤں اور بزرگوں کا حال درج ہے۔ مسلم تہذیب اور بزرگوں کا نام تک نہیں۔ اس کمی کو پورا کیا جائے۔

۴۔ ودیا مندر اسکیم کی رو سے مدرسہ کھولنے کے لیے چالیس لڑکوں کی شرط ختم کی جائے۔ جہاں پانچ بچے بھی اردو پڑھنے والے ہیں، وہاں اردو رسم الخط میں بندوبست کیا جائے۔

گاندھی کے نام کھلا خط لکھا۔ "اگر مسلمانوں کی شکایات رفع نہ ہوئیں تو ان پر ان ہی کے حربے استعمال ہوں گے۔"

سی پی میں انجمن کے رضاکاروں اور کارکنوں نے سارے صوبے کا دورہ کیا۔ شہر شہر قصبہ قصبہ انجمن کی شاخیں، کتب خانے قائم کئے، مدارس قائم کیے۔ چھوٹا ناگپور میں عیسائیوں کا زور تھا۔ عبدالحق نے انہیں اعتماد میں لے کر عیسائی بچوں کے لیے اردو مدرسے کھولے۔ اچھوتوں کے لیے بھی اردو مدرسے کھولے گئے۔ سی پی کے تمام کالجوں کے لیے اردو کی تدریس کے لیے لیکچرار مقرر کیے۔ ڈاک خانوں کے فارموں اور ریل کے ڈبوں پر اردو تحریر کی جانے لگی۔ عبدالحق ہی کی کوششوں سے سی پی اسمبلی میں اردو میں تقاریر کا آغاز ہوا۔ یہ شور اتنا مچا، مرہٹے اردو بولنے لگے۔ ناگپور اردو کا مرکز بن گیا۔

بنگال میں اردو تدریس کا انتظام نہیں تھا۔ وہ طلبہ جو دینی تعلیم کے لیے دلی میں مقیم تھے ان کے لیے عبدالحق نے مسجد فتح پوری میں دو کمرے کرائے پر لے کر شبینہ مدرسہ قائم کیا تاکہ یہ طالب علم اردو پڑھیں۔

مالابار میں تقریباً آٹھ لاکھ عربی النسل مسلمان آباد تھے۔ عبدالحق نے وہاں بھی مدرسے قائم کرائے۔

صوبوں کے ساتھ ساتھ ریاستوں میں بھی اردو کے خلاف جال بچھایا گیا تھا۔ عبدالحق نے اپنی تدبیروں سے اس جال کو کاٹ کر رکھ دیا۔ ہر طرف اُردو کا ڈنکا بجنے لگا۔

یہ کام یونہی نہیں ہوگئے۔ اردو کا یہ سپاہی ہر جگہ سینہ سپر ہو کر لڑا۔ کہیں کامیابی ہوئی کہیں ناکامی لیکن اس نے آس نہ توڑی۔ وہ برابر کام میں لگا رہا۔ عمر ایسی تھی کہ آسائش کی ضرورت تھی۔ بہت سے علمی و ادبی کام ایسے تھے جنہیں بیٹھ کر کرنے کی ضرورت تھی لیکن وہ پورے ہندوستان میں مارا مارا پھر رہا تھا۔ ہمدردوں کی ہمدردی اپنی جگہ لیکن اس کا ایک ہی جواب تھا۔

"عربی کی ایک مشہور مثال ہے کہ کسی چیز کی محبت انسان کو اندھا کردیتی ہے۔ مجھے اردو سے محبت ہے اور مجھے اعتراف ہے کہ یہ محبت جنوں کی حد تک ہے لیکن اس کے ساتھ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اردو سے میری وابستگی کا یہ سلسلہ پوری قوم کی تہذیب وثقافت، تصورات و نظریات اور اس کے عزائم اور حوصلوں سے ملتا ہے اور کون ایسا بدبخت ہے جسے اپنی قومی روایات اور تہذیبی اقدار سے محبت نہ ہوگی۔"

اب وقت آگیا تھا کہ انجمن ترقیِ اردو کے اہتمام و انتظام میں برطانوی ہند کے کسی موزوں مقام پر ایک اردو یونیورسٹی قائم کی جائے چنانچہ ۱۹۴۰ء میں ناگ پور کے کھلے اجلاس میں اردو یونیورسٹی کے قیام کے سلسلے میں اتفاقِ رائے سے اس کی تجویز پاس ہوئی۔

اردو یونیورسٹی کے قیام کی اس اہم اور تاریخی تجویز کا ملک کے طول و عرض میں بڑی گرم جوشی سے خیر مقدم کیا گیا۔

وہ اس کانفرنس کے کامیاب انعقاد کے بعد دلی واپس آگئے۔ اب انہیں اردو یونیورسٹی کے لیے معتبر اصحاب کو اعتماد میں لینا تھا۔ انہوں نے اس کا آغاز قائداعظم محمد علی جناح سے کیا۔ انہوں نے قائداعظم کو اپنے ساتھ دوپہر کا کھانا کھانے کی زحمت دی۔

کھانے پر جہاں ہندوستان کی عمومی سیاست اور دیگر مسائل پر بات ہوئی، وہیں مجوزہ یونیورسٹی کا بھی ذکر آیا۔ قائداعظم نے اس سے بڑی دلچسپی اور ہمدردی کا اظہار فرمایا۔

اردو یونیورسٹی ایک بڑا منصوبہ تھا۔ سب سے بڑا مسئلہ سرمائے کی فراہمی کا تھا۔ وہ اس سلسلے میں کوششیں کرتے رہے لیکن مصیبت یہ تھی کہ اردو کے کام میں قدم قدم پر روڑے اٹکائے جارہے تھے اور انہیں ہر اس جگہ پہنچنا ہوتا تھا جہاں ان کی ضرورت ہو۔ آئے دن دوروں پر رہنا پڑتا تھا۔ ایک چومکھی لڑائی تھی جسے وہ لڑ رہے تھے۔ تصنیف و تالیف کے شغل کو بھی بالائے طاق نہیں رکھ سکتے تھے۔ اس پُر آشوب دور میں بھی "ہماری زبان" جاری کیا۔ اب کام کرنے والے بہت تھے لیکن نگرانی تو انہی کو کرنی تھی۔ ان سب کاموں کی بدولت یونیورسٹی کا کام بہت سست روی سے چل رہا تھا۔

اسی دوران میں یہ خیال آیا کہ دلی میں انجمن کی اپنی عمارت ہو۔ اس کام کے لیے انہوں نے چندہ اکٹھا کرنا شروع کیا۔ ایک مرتبہ اپنی کل پونجی ۵۶ ہزار روپے چندے میں دے دیے اور قطعۂ زمین حاصل بھی کرلیا۔

انجمن کے دفتر (دریا گنج) میں بڑی رونق رہنے لگی تھی۔ ہر وقت مہمانوں سے کمرے بھرے رہتے تھے۔ ان میں مسلم لیگی بھی تھے، کانگریسی بھی۔ خلافت کمیٹی والے بھی تھے اور کمیونسٹ بھی۔ کونسلوں کے ممبر بھی تھے اور لیڈر بھی۔ اہلِ علم بھی تھے اور طالب علم بھی۔ گاندھی جی کے معتقد بھی اور ان کے مخالف بھی تھے۔ یہ گرم بازاری نتیجہ تھی بابائے اردو کی مقبولیت اور ان کے خلوص کا۔ ان کی مخالفت کرنے والے بھی ان کے خلوص سے انکار نہیں کرسکتے تھے۔ حتیٰ کہ گاندھی جی تک یہ کہنے پر مجبور ہوگئے کہ "مولوی عبدالحق نے اردو زبان کی بڑی خدمت کی ہے۔"

اتنی بھیڑ اور چہل پہل میں کام کرتے رہنا کچھ انہی کا حصہ تھا۔ سچ ہے محبت انسان کو اندھا ہی نہیں بہرا بھی کردیتی ہے۔ وہ اسی بھیڑ میں بیٹھے بڑے اطمینان سے کام کرتے رہتے تھے۔

وقت بڑی تیزی سے آگے بڑھ رہا تھا۔ آزادی کے دن قریب آرہے تھے۔ گاندھی جی کے سامنے اب اردو سے بھی بڑے مسائل تھے لیکن زبان کے نام پر نفرت کے جو بیج انہوں نے بُو دیے تھے، ان کی فصل تیار ہونے لگی تھی۔

چودھویں جولائی ۱۹۴۷ء کا دن تھا۔ وہ حسبِ معمول اپنے کمرے میں حسبِ معمول کام کررہے تھے کہ اُن کے ایک مہمان جو کئی روز سے انجمن کے دفتر میں ٹھہرے ہوئے تھے، کمرے میں داخل ہوئے۔

"تیار ہوجایئے۔ آپ کو میرے ساتھ حیدر آباد چلنا ہے۔"

"ایسی کیا وحشت ہے؟"

"میں آپ کا ٹکٹ خرید چکا ہوں۔ کل صبح کی فلائٹ ہے۔"

ان کی قسمت میں بھلائی تھی کہ جی میں آگئی۔ حیدر آباد کا نام سن کر جی للچا گیا۔ رضامندی ظاہر کردی اور دوسرے دن کی فلائٹ سے وہ حیدر آباد' دلی سے دور چلے گئے یا قدرت نے انہیں وہاں سے ہٹا دیا۔

حیدر آباد میں کچھ کام تھے انہیں نمٹاتے نمٹاتے آخر اگست آگیا۔ ۳۰ ستمبر کی شام کو وہ بھوپال کے لیے روانہ ہوگئے۔ وہاں سے بذریعہ جہاز دلی جانے کا ارادہ تھا۔

بھوپال پہنچ کر معلوم ہوا کہ دلی کے حالات بہت خراب ہیں۔ ابھی وہاں جانا خلافِ مصلحت ہوگا۔ آخر یہ طے پایا کہ بھوپال میں قیام کرکے کچھ دن انتظار کیا جائے اور اسے رکنا پڑا۔

تین چار روز کے بعد ہی جو خبریں آئیں وہ بے حد پریشان کن تھیں۔ محلے کے محلے اجڑ گئے تھے۔ خون پانی کی طرح ارزاں تھا۔ پاکستان بنانے کی پاداش میں مسلمانوں کو تہِ تیغ کیا جارہا تھا۔ اب اسے یقین ہوگیا کہ کسی غیبی طاقت نے اسے دلی سے حیدر آباد بھیج دیا تھا ورنہ اس پر تو پاکستان سے ہمدردی ہی کا نہیں اردو کی حفاظت کا الزام بھی آتا۔

میری انجمن! اپنی ذات کا خیال آتے ہی اسے انجمن کا خیال آگیا۔ میرے دفتر پر کیا بیتی ہوگی۔ اردو سے میری محبت کا بدلہ انجمن کے بے جان درودیوار سے نہ لیا گیا ہو۔ میں یہاں ہوں لیکن میرے اہل کار تو دفتر ہی میں ہوں گے۔ الٰہی خیر کیجیو۔

کہیں سے اڑتا ہوا ایک خط بھوپال پہنچ گیا "بلوائیوں نے انجمن کے مکان پر حملہ کیا۔ تمام سامان اور مال و اسباب لوٹ لیا۔ مکان کھلا پڑا ہے اور اللہ کی امان میں ہے۔ ظالم بلوائیوں نے ایک کاتب اور اس کے بیوی بچوں کو قتل کر ڈالا۔ باقی ملازمین اِدھر اُدھر بھاگ گئے۔"

خط کیا تھا' کرب وبلا کا اطلاع نامہ تھا۔ انسانی جانوں سے بھی زیادہ وہ قیمتی اور نادر کتابیں تھیں جو اس نے برسوں کی محنت کے بعد جمع کی تھیں۔ انسان تو ایک مرتا ہے لیکن ایک نایاب کتاب کا مٹ جانا' پورے دور کا فنا ہو جانا ہے۔

اس نے چاہا کہ وہ خود جائے اور دیکھے کہ کیا رہا' کیا کھویا' کیا بچا لیکن احباب پھر مانع آئے کہ یہ وقت دلی جانے کا نہیں۔ دلی میں کسی کو خط لکھا۔ وہاں سے بھی یہی جواب آیا کہ یہ وقت اس مقتل میں آنے کا نہیں خصوصاً بابائے اردو کا۔ قوم پرست ہندو' اردو کے حوالے سے اس کے خون کے پیاسے ہیں۔ ناچار دل مسوس کر رہ گیا۔

کتب خانہ لٹ جانے کا ایسا صدمہ ہوا کہ وہ صاحب فراش ہوگیا۔ غصہ تھا کہ بخار کی شکل اختیار کر گیا۔ انگلیاں لکھنے کی عادی تھیں اور اب لکھنے کو کچھ نہیں رہ گیا تھا۔ بجز اس کے کہ اِدھر اُدھر خط لکھ کر حالات دریافت کرتا رہے۔ پھر اسے کچھ کام یاد آگئے۔ بھوپال میں خالی پڑے پڑے دل ڈوبنے لگا تھا۔ بخار سے نجات پاتے ہی وہ حیدر آباد چلے گئے۔ وہاں جو کام باقی رہ گیا تھا' اسے سمیٹنے میں لگ گئے۔

دلی بدستور مصائب کی آماجگاہ بنی ہوئی تھی۔ خوں ریزی کا بازار گرم تھا۔ ایسا بازار جس کے سامنے نادر شاہ کا قتل عام اور غدر کے مظالم ہیچ تھے۔ گاندھی جی کے جلسوں میں نہ عبادت کا تقدس باقی رہ گیا تھا نہ روحانیت کی روشنی۔ گاندھی جی ہر اس جگہ پہنچتے تھے جہاں درندگی برہنہ ہو کر ناچ رہی تھی لیکن اس وقت جب سب کچھ لٹ چکا ہوتا تھا۔ ان کے یہ دورے سیاسی چال سے زیادہ کوئی اہمیت نہیں رکھتے تھے۔

آخر کار نو نومبر ۱۹۴۷ء کو انہیں ابوالکلام آزاد کی وساطت سے دلی جانا نصیب ہوا۔ دوسرے ہی دن وہ انجمن کا مکان دیکھنے دریا گنج پہنچ گئے۔

"کس دل سے آئے ہیں ہم کچھ دل ہی جانتا ہے۔"

وہ سب سے پہلے اس کمرے میں گئے جہاں وہ کام کرتے تھے یہاں کا نقشہ ہی دوسرا تھا۔ کبھی یہاں کتابوں کی متعدد الماریاں ہوتی تھیں۔ کھلی الماریوں کے علاوہ دو بڑی فولادی الماریاں تھیں جن میں خاص خاص نادر قلمی نسخے اور قدیم فرامین اور کاغذات اور بعض نامور اشخاص مثلاً ناسک' غالب' سرسید' حالی' اقبال' سرتیج بہادر سپرو وغیرہ کے خطوط اور اسی قسم کی بیشتر نادر اشیا تھیں۔ اس کے علاوہ کئی بڑے صندوق تھے جن میں ان کے تیار کردہ نوٹس اور واقعات سے متعلق یادداشتیں' اردو' ہندی تنازعے سے متعلق بہت سے قدیم کاغذات اور بہت بڑا حصہ اردو لغات کے صاف کیے ہوئے مسودوں کا تھا۔

اب ان الماریوں اور صندوقوں کی حالت دیکھی نہیں جاتی تھی۔ کچھ صندوق جو نئے اور اچھے تھے' غائب تھے۔ غالباً لٹیرے اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ کتابوں کے صفحات کچھ پھٹے کچھ ثابت اِدھر اُدھر بکھرے پڑے تھے۔ وہ انہی صفحات پر پاؤں رکھتا' بچاتا کھانے کے کمرے میں گیا کیونکہ دو مقفل الماریاں وہاں بھی تھیں۔ شاید وہ بچ گئی ہوں؟ لیکن یہ محض اس کی خوش فہمی تھی۔ ان الماریوں کا بھی وہی حشر ہوا تھا۔ ان الماریوں میں قلمی بیاضیں تھیں لیکن اب ان کے پھٹے

ہوئے صفحات اس طرح بکھرے پڑے تھے جیسے پت جھڑ کے موسم میں درختوں کے پتے۔

مالک مکان نے کرائے کے لالچ میں یہ مکان بھارت انشورنس کمپنی کو دے دیا تھا لہٰذا کمرے خالی کرنے کے لیے انہوں نے متعدد کمروں کی بیش قیمت کتابیں اور کاغذات کوڑے کرکٹ کی طرح صحن میں پھینک دیے تھے بہت سے کاغذ ہوا میں اڑ گئے اور کچھ آنے جانے والوں کی روندن میں آگئے جو کتاب یا کوئی چیز کسی کو پسند آئی' وہ اٹھا کر چل دیا۔

نیچے کے کمرے رسالوں اور اخباروں سے پٹے پڑے تھے۔ مالک مکان نے ان کمروں کو خالی کرنے کے لیے یہ اخبار اور رسائل باورچی خانے' غسل خانوں اور گودام میں پھنکوا دیے۔

کتب خانے کو کھول کر دیکھا تو معلوم ہوا یہاں بھی لٹیروں کے قدم آئے تھے۔ الماریوں کی کتابیں درہم برہم تھیں۔ کچھ زمین پر پڑی ہوئی تھیں۔ الماریوں کے تالے ٹوٹے ہوئے تھے۔

وہ جب انجمن کا دفتر لے کر حیدر آباد سے دہلی آئے تھے تو مال گاڑی کے کئی ڈبے سامان سے بھر گئے تھے۔ اور اب اسی سامان کا جو حشر ہوا تھا اس کے سامنے تھا۔ میرا قصور؟ قصور تو ان لاکھوں عزیز جانوں کا بھی نہیں تھا جو ظلم وجبر کا شکار ہو گئیں۔ قصور تو ان عورتوں کا بھی نہیں تھا جن کی بے حرمتی ہوئی۔ ان معصوم بچوں کا بھی نہیں تھا جن کے ٹکڑے کر دیے گئے۔ جب ان بے قصوروں کا یہ حشر ہوا تو پھر اس سامان کے لٹ جانے کا کیا افسوس! وہ یہی سوچتے ہوئے' راستے بھر ادھ جلے مکانوں کو دیکھتے ہوئے اپنی قیام گاہ پر لوٹ آئے۔

چودھری رحم علی' محمد یعقوب' رفیق الدین احمد اور ایسے ہی چند ہمدرد ان کے ساتھ تھے۔ ان سب نے یہ طے کیا کہ جو ہو گیا اس پر افسوس کرنا اور حوصلہ ہارنا بے کار ہے۔ اب یہ کیا جائے کہ جو کتابیں بچ گئی ہیں' انہیں یکجا کیا جائے۔ ردی سمیٹ لی جائے۔ شاید کچھ کام کی چیزیں بچ گئی ہوں۔

وہ دوسرے دن پھر انجمن کے دفتر پہنچ گئے۔ ردی کے ڈھیروں کا ایک ایک کاغذ دیکھنا شروع کیا۔ کسی کتاب کا کوئی کاغذ ایک جگہ' کوئی دوسری جگہ ملا۔

پہلے ہی دن اندازہ ہو گیا کہ اس کام میں تو کئی مہینے لگ جائیں گے۔ اتنے عرصے تک مولانا ابوالکلام آزاد کے گھر مہمان رہنا ٹھیک نہیں تھا لہٰذا وہ اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ نظام پیلس کے گیسٹ ہاؤس میں اٹھ گئے۔

ردی کی چھٹائی کا کام جاری تھا۔ بعض نسخوں کے کاغذات مختلف جگہوں سے ملے مگر پھر بھی ناقص رہے۔ بعض کے حصے پھٹے ہوئے ملے۔

ایک ایک کاغذ کو دیکھنا' اسے پڑھنا۔ پھر جوڑ سے جوڑ ملانا۔ یہ کام آسان نہیں تھا۔ صبح سے شام تک کرنے کے بعد کپڑے اور صورتیں گرد سے اٹ جاتی تھیں۔ پھر بھی ایک کونا صاف نہیں ہوتا تھا۔

نظام پیلس میں گئے ہوئے ابھی چار ہی روز ہوئے تھے کہ معلوم ہوا۔ حیدر آباد سے کوئی وفد آ رہا ہے اس لیے گیسٹ ہاؤس خالی کرنا پڑے گا۔ انہوں نے بہت کوشش کی کہ کوئی مکان مل جائے یا کوئی اور صورت ٹھہرنے کی نکل آئے لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔

انجمن کی شاخیں سارے ملک میں تھیں۔ تقسیم کے بعد پاکستان کی شاخوں کا الحاق ہندوستان سے قائم نہیں رہ سکتا تھا۔ اس لیے ضروری تھا کہ پاکستان کے لیے نیا مرکز قائم کیا جائے۔

نظام پیلس سے اٹھنا پڑا تو انہوں نے یہ سوچا کہ کراچی جا کر وہاں کے لیے نئے مرکزی دفتر کا انتظام کر لیا جائے۔

دہلی کے دفتر میں ردی کی چھٹائی کا کام جاری تھا کہ وہ کراچی کے لیے روانہ ہو گئے۔

کراچی میں پیر الٰہی بخش ان کے شفیق کرم فرما تھے لہٰذا ان کے ہاں قیام کیا۔

۱۹۳۶ء میں جب علی گڑھ میں کل ہند اردو کانفرنس ہوئی تھی اور انجمن کے مرکزی دفتر کے لیے نام تجویز کیے گئے تھے تو علامہ اقبال نے لاہور کا نام پیش کیا تھا لیکن اس وقت یہ دفتر دہلی میں قائم کیا گیا تھا۔ کراچی پہنچنے کے بعد عبدالحق کو اقبال کی یہ تجویز یاد آئی۔ انہوں نے شاعرِ مشرق کے اس خواب کو تعبیر عطا کرنے کا فیصلہ کیا اور چاہا کہ مرکزی دفتر لاہور میں ہونا چاہیے۔ انہوں نے وزیر مہاجرین میاں افتخار الدین احمد کو خط لکھا۔

"ہم سب کی رائے یہ ہے کہ اب انجمن کا صدر مقام لاہور ہونا چاہیے۔ میں نے سنا ہے ہندوؤں نے جو عمارتیں اور پریس وغیرہ چھوڑے ہیں' ان کی تقسیم عمل میں آ رہی ہے۔ اگر آپ کے توسط سے ہمیں کوئی اچھا پریس اور مکان مل سکتا ہے ہم بہ خوشی اسے خریدنے کے لیے تیار ہیں۔"

اس خط کا جب انہیں کوئی جواب نہیں ملا تو وہ خود لاہور گئے اور میاں بشیر احمد کو یاد دہانی کرائی۔ انہوں نے لاہور کے ممتاز اور بااثر ادیبوں کو مدعو کیا۔ یہاں کچھ ایسی باتیں ہوئیں

جن سے تاثر ملتا تھا کہ یہ حضرات نہیں چاہتے کہ انجمن یہاں آئے۔

اس طرف سے مایوس ہوجانے کے بعد کراچی ہی ایک ایسا شہر تھا جو انجمن کے دفتر کے لیے مناسب تھا۔ اب یہاں کوئی موزوں مکان ڈھونڈنے کی ضرورت تھی۔ مکان کی تلاش سید بشیر علی کے ذمّے تھی۔ وہ کئی روز تک کراچی کی سڑکیں ناپتے رہے۔ دن بھر میں جو مکان دیکھتے رات کو بیٹھ کر اس پر تبصرے ہوئے۔ ہر مکان میں کوئی نہ کوئی کمی نظر آتی تھی۔ بالآخر ایک سہ منزلہ مکان کا انتخاب ہوگیا لیکن مصیبت یہ تھی کہ اس پر مہاجرین کا قبضہ تھا۔

جب اس کا ذکر کراچی کے میئر حکیم محمد احسن سے ہوا تو انہوں نے یہ مناسب نہ سمجھا کہ یہ عمارت مہاجروں سے خالی کروائی جائے۔

"شاردا مندر کی عمارت خالی پڑی ہے۔ آپ اسے الاٹ کرالیں۔"

شاردا مندر گجراتیوں کا سب سے بڑا ادارہ تھا۔ یہاں بارہ سو کے قریب طلبہ تعلیم حاصل کرتے تھے۔ دفتر کے لیے اس سے بہتر عمارت دوسری نہیں ہوسکتی تھی۔ عبدالحق نے اس کے معائنے کے بعد رضامندی ظاہر کردی اور یہ عمارت انجمن ترقی اردو کے نام الاٹ ہوگئی۔

احباب کا اصرار تھا کہ وہ یہیں رک جائیں۔ ہندوستان میں اب اردو کا کوئی مستقبل نہیں لیکن وہ دلی جانے کے لیے بے چین تھے۔

"ہندوستان میں ہمارے لاکھوں، کروڑوں بھائی اس زبان کے بولنے والے ہیں۔ ان کی خدمت کرنا بھی ہمارا فرض ہے۔"

آخروہ نہ مانے اور جنوری ۱۹۴۸ء میں بذریعہ ہوائی جہاز دلی روانہ ہوگئے۔ انہیں یہ اطمینان ہوچکا تھا کہ کراچی میں مرکزی دفتر کا انتظام توہو ہی چکا ہے۔

دلی میں ان کے دفتر میں ردی کی چھٹائی کا کام ابھی تک جاری تھا لیکن اتنا کام ہوچکا تھا کہ نقصان کا اندازہ ہوسکتا تھا۔ اب جو غور کیا تو بہت سے مسودے تلف ہوچکے تھے۔ کچھ نامکمل رہ گئے تھے۔ دل پر ایک چوٹ سی لگی لیکن کس کس چوٹ پر کتنی دیر رویا جاتا۔ ابھی انہیں اپنے کام کو پھر سے جاری کرنا تھا "یعنی آگے چلیں گے دم لے کر۔"

وہ گاندھی سے مل کر اپنے آئندہ عزائم بیان کرنا چاہتے تھے۔ ان سے تحفظات کی ضمانت لینی تھی۔ انہیں یہ بتانا تھا کہ ہندی اردو تنازعہ اب ختم ہوچکا۔ اردو والوں نے پاکستان حاصل کرلیا، ہندی والوں نے ہندوستان۔ اب جھگڑا ہی ختم ہوگیا۔ وہ یہیں رہ کر ادبی کام کرتے رہیں گے لیکن اسی روز انہوں نے برت (بھوک ہڑتال) رکھ لیا۔ پانچ روز بعد برت توڑدیا لیکن کسی سے مل نہیں رہے تھے۔

وہ اپنے دیرینہ ساتھی کے ساتھ علی گڑھ چلے گئے کہ گاندھی سے ملاقات واپسی میں ہوجائے گی۔ جو گلے شکوے ہیں، دور ہوجائیں گے۔

حالات نے ایک سال میں ایک صدی کی کروٹیں بدل لی تھیں۔ انقلاباتِ زمانہ نے کیا سے کیا رنگ اختیار کرلیا تھا۔ عبدالحق کے نزدیک اب پہلے سے بھی زیادہ اس بات کی ضرورت تھی کہ اردو کا تحفظ کیا جائے اور اس کی حفاظت کا شعور بیدار کیا جائے لیکن یہ کام اب پہلے سے بھی زیادہ مشکل ہوگیا تھا۔ کانگریس نے اپنی چند وزارتوں کے بل بوتے پر کیسا طوفان برپا کیا تھا۔ اب تو پورے ملک پر ان کی حکومت تھی۔ اب یہ جنگ شاید چند صوبوں تک محدود نہ رہے۔

ان نئے حالات میں نئی حکمتِ عملی اختیار کرنے کی ضرورت تھی۔ اس کے ساتھ ہی یہ دیکھنا تھا کہ انجمن کا صدر دفتر کہاں مناسب رہے گا؟ ۱۹۳۶ء میں حیدر آباد دکن کے مقابلے میں اس کے لیے دہلی کو مناسب سمجھا گیا تھا، اب اسے کہاں لے جایا جائے؟

ان مسائل پر غور کرنے کے لیے انہیں مشاورت کی ضرورت تھی۔ ان کی درخواست پر اولڈ بوائز لاج میں ہمدردانِ اردو کا اجتماع ہوا۔ اس اجتماع میں کل پچیس حضرات تشریف لائے۔ یہ حضرات موجودہ حالات سے اتنے خوف زدہ اور سہمے ہوئے تھے کہ اپنی رائے دیتے ہوئے جھجکتے تھے۔ کوئی شخص قطعی رائے دینے کو تیار نہیں تھا۔ ہمدردی سب کو تھی لیکن ان سب نے آگ اور خون کے وہ تماشے دیکھے تھے کہ اردو کی بات کرنے ہی کو حکومت کی مخالفت تصور کررہے تھے۔ ابھی حکومت کی پالیسی کا بھی ٹھیک طرح اندازہ نہیں ہوسکا تھا اس لیے بھی کوئی رائے قائم نہیں ہوسکتی تھی۔ اجتماع کے سامنے دونوں مسئلے رکھے گئے لیکن دونوں مسئلے تشنہ بحث کا شکار ہوگئے۔ گول مول لفظوں میں سب کا خیال یہی تھا کہ صدر دفتر دہلی ہی میں ہونا چاہیے۔ انجمن کا لائحۂ عمل کیا ہو؟ اس کا فیصلہ وقت کرے گا۔ حکومت کی نیت کا علم تو ہو۔

اب جو کچھ کرنا تھا خود عبدالحق کو کرنا تھا۔ انہوں نے سوچ لیا تھا کہ واپس جاکر وہ گاندھی سے ملیں گے۔ ان کی غلط فہمیاں دور کریں گے اور اپنا لائحۂ عمل ان کے سامنے رکھیں

گے۔ اب اس مسئلے کو سیاست سے الگ کرنا ہوگا۔ انجمن کو اب پھر پرانے لائحہ عمل پر عمل کرتے ہوئے ادبی کاموں تک خود کو محدود کرنا ہوگا۔ انہیں امید تھی کہ گاندھی کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا اور انہیں کام کرنے کی اجازت مل جائے گی۔ رفتہ رفتہ سب ٹھیک ہوجائے گا۔ ہندوستان میں لاکھوں لوگ ہیں جو اردو بولتے ہیں۔ انجمن کی ضرورت تو بہرحال رہے گی۔

۲۸ جنوری کو وہ الہ آباد کے لیے روانہ ہوگئے۔ وہاں کچھ کام تھا۔ اس کے بعد انہیں دلی جاکر گاندھی سے ملاقات کرنی تھی۔

الہ آباد میں انہوں نے اپنے دوست ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کے مکان پر قیام کیا۔

"مولوی صاحب، اب کیا سوچا" عبدالستار صدیقی نے ان سے پوچھا۔

"نقصان تو بہت ہوگیا ہے۔ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو کمر ٹوٹ چکی ہوتی لیکن میں انجمن کو نہیں چھوڑ سکتا، میں چھوڑ بھی دوں تو انجمن مجھے نہیں چھوڑے گی۔ زندگی بھر کا عشق ہے ڈاکٹر صاحب!"

"وہ تو ہے لیکن آپ نے اپنے لیے کیا سوچا۔ اب ایک نہیں دو انجمنیں ہیں۔"

"میں مستقل ایک جگہ کا ہوکر نہیں رہنا چاہتا۔ میں دونوں جگہوں پر اردو کی ترویج کا عزم کیے ہوئے ہوں۔ اسی سلسلے میں گاندھی سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"تو پھر دیر کیا ہے؟"

"بس دو دن یہاں ٹھہروں گا۔ یکم فروری کو گاندھی جی سے مڈبھیڑ ہوگی۔"

انہوں نے پیر حسام الدین راشدی کو بھی لکھ دیا تھا "جب کوئی مناسب مکان مل گیا تو دفتر و کتب خانہ اس میں منتقل کرکے کراچی چلا آؤں گا۔ وہاں مجھے کسی علیحدہ مکان کی ضرورت نہیں۔ شاردا مندر میں رہ کر کام کروں گا اور رات کو وہیں پڑا رہوں گا۔ میرے پاس اب کیا ہے جو مکان کی ضرورت ہو۔ ایک بچھونا اور دو چار کپڑے ہیں اور بس۔ دوسرے مجھے تو دونوں ملکوں میں رہنا ہے۔"

۳۰ جنوری ۱۹۴۸ء کو وہ اپنے کمرے میں بیٹھے تھے۔ مغرب کا وقت ہوچکا تھا کہ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کے فرزند زبیر صدیقی گھبرائے ہوئے گھر میں داخل ہوئے۔

"کسی نے گاندھی جی کو گولی مار کر ہلاک کردیا۔"

"یاالٰہی خیر! اب مسلمانوں کا کیا ہوگا۔ کیا انہیں ایک اور خون کا دریا پار کرنا ہوگا۔ اس قتل کا الزام بھی مسلمانوں ہی کے سر جائے گا۔" مولوی صاحب کی زبان سے بے اختیار یہ کلمات نکلے۔

جلد ہی یہ خبر آگئی کہ یہ کارنامہ کسی مسلمان کا نہیں۔ قاتل انہی کا ہم قوم تھا۔ ہندوستان کے مسلمان ایک بڑی آزمائش سے بچ گئے۔ مسلمان گھروں کے بجھے ہوئے چراغ پھر سے جل گئے لیکن عبدالحق کے دل کا اندھیرا پہلے سے بھی بڑھ گیا۔ گاندھی سے ملاقات کی حسرت دل ہی میں رہ گئی۔ گاندھی ان کے مخالف ضرور تھے لیکن ان کے کام کی قدر بھی کرتے تھے۔ انہیں امید تھی کہ ان سے مل کر انجمن کے بہت سے مسئلے حل ہوجائیں گے لیکن اے بسا آرزو کہ خاک شدہ!

وہ ایک مرتبہ پھر دلی چلے گئے۔ یہاں انہیں انجمن کے لیے مکان تلاش کرنا تھا۔ کوچہ گردی آبلہ پائی بن گئی لیکن مکان کا انتظام نہ ہوسکا۔ کوئی ڈر کے مارے مکان دینے کو تیار ہی نہیں تھا۔

پنڈت کیفی، سرتیج بہادر سپرو، پنڈت کشن پرشاد کول، ڈاکٹر تاراچند جیسی ہستیاں زبان کے مسئلے پر ان کی ہم نوا تھیں لیکن مکان کے حصول میں کسی کی کوششیں بار آور نہیں ہورہی تھیں۔

زاہد حسین صاحب کا جن کے پاس ان کا قیام تھا، دلی سے کراچی تبادلہ ہوگیا۔ اب خود ان کے قیام کی کوئی صورت نہ رہی تھی لہٰذا انہیں بھی کراچی واپس آنا پڑا۔

یہاں آتے ہی وہ اپنے کام میں مصروف ہوگئے اور انجمن ترقی اردو پاکستان کا ڈول ڈالنا شروع کیا۔

انہوں نے بڑی امنگوں کے ساتھ قائداعظم محمد علی جناح کو خط لکھا کہ وہ انجمن کا افتتاح اپنے دستِ مبارک سے فرمائیں۔ جس محبت سے انہوں نے خط لکھا، اسی محبت سے جواب آیا۔ قائداعظم نے بڑی مسرت کا اظہار کیا اور لکھا کہ آج کل بہت مصروف ہوں۔ سرحد کے دورے سے واپسی پر ۱۵ اپریل کے بعد کسی روز بڑی خوشی سے انجمنِ ترقیِ اردو پاکستان کا افتتاح کروں گا۔

کراچی میں انجمن کا کام آہستہ آہستہ جم رہا تھا لیکن ان کے دل کو دلی بے چین کیے ہوئے تھی۔ سوتے جاگتے وہیں کے خواب دیکھتے تھے۔ خاص کر اپنے کتب خانے کا خیال ستاتا تھا کہ کیسی کیسی کتابیں برباد ہوکر رہ گئیں۔

عمر کے آخری حصے میں اپنی علمی اور عملی سرگرمیوں کے بہترین مرکزوں سے جدائی۔ دلی کی ادبی محفلوں کا اجڑنا اور

سب سے بڑھ کر دریا گنج دہلی میں انجمن کے دفتر اور بیش قیمت کتب خانے کی تباہی ایسے صدمات نہیں تھے جو آسانی سے برداشت کیے جاسکتے۔ ان مستقل صدموں نے ان کی صحت پر نہایت ناگوار اثرات ڈالے۔ احباب کی یہ رائے قرار پائی کہ وہ تبدیلیِ آب وہوا کے لیے کوئٹہ چلے جائیں جہاں کی آب وہوا صحت کے لیے بے نظیر ہے۔

مستقل کام کرتے رہنے ہی میں ان کی زندگی کا دارومدار تھا۔ طبیعت کیسی ہی ناساز ہو، کام کیے بغیر رہ نہیں سکتے تھے۔ ان کی نبض کتابوں کے ساتھ چلتی تھی۔ محض سیر و تفریح کے مواقع ان کی زندگی میں بہت کم آئے ہوں گے۔ ڈاکٹر لاکھ کہتے تھے کہ کام کی زیادتی سے گریز کریں لیکن بچپن سے اب تک کی عادت چھوٹ ہی نہیں سکتی۔ وہ کوئٹہ تبدیلیِ آب وہوا کے لیے جارہے تھے لیکن کتابوں اور کاغذات کا انبار ان کے ہمراہ تھا۔

کوئٹہ میں ان کے لیے ایک نہایت عظیم الشان چنار کے درخت سے متصل کہ جس کی بلندی اور پھیلاؤ کو دیکھ کر قدرت کا تماشا نظر آتا تھا، ایک ڈیرا لگا دیا گیا۔ وہ دن بھر اس درخت کے زیرِ سایہ بیٹھے کام کرتے رہتے اور اس شاندار درخت کی شوکت، عظمت اور گھنے سائے کا لطف اٹھاتے۔

ابھی کوئٹہ کی آب وہوا سے لطف اندوز ہوتے ہوئے بہ مشکل سولہ سترہ دن گزرے ہوں گے کہ کراچی سے یہ وحشت ناک خبر ان تک پہنچی کہ اگر وہ فوری طور پر دلی نہ پہنچے تو حکومت، انجمن ترقیِ اردو، ہند کو امداد بھی نہیں دے گی (جس کی منظوری ہوچکی تھی) زمین بھی ضبط کرلے گی اور کتب خانے سے بھی ہاتھ دھونے پڑیں گے۔ یہ خبر بعض نہایت معتبر اشخاص دلی سے لائے تھے۔ اس لیے یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ ہی نہیں تھی۔ طبیعت کی ناسازی میں پریشانی کا عنصر بھی شامل ہوگیا۔ وہ دوسرے ہی دن یعنی ۱۰ اگست ۱۹۴۸ء کو کراچی روانہ ہوگئے۔ تاکہ احباب سے مشورہ کرنے کے بعد کسی نتیجے پر پہنچا جائے۔ احباب کا مشورہ یہ تھا کہ پہلے کوئی دلی جاکر تمام حالات معلوم کرے اس کے بعد وہ جائیں۔ اسے احباب کے مشوروں کے سامنے سر جھکانا پڑا۔

۱۱ ستمبر کی شب کو قائدِاعظم رحلت فرماگئے۔ ان کے ہاتھوں انجمن کے افتتاح کی حسرت ہی رہ گئی۔

ابھی وہ اس خبر سے سنبھلنے نہیں پائے تھے کہ یہ خبر پہنچی کہ بھارت کی فوج حیدر آباد پر چڑھ آئی ہے۔ حیدر آباد میں انہوں نے اپنی عمر کے چالیس برس گزارے تھے۔ یہی وہ سرزمین تھی جہاں ان کی جوانی نے دن گزارے تھے اور پھر انہیں بوڑھا ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔ یہی وہ سرزمین تھی جہاں انجمن ترقیِ اردو نے اپنے عروج کی منزلیں طے کی تھیں۔ پھر یہ خبر بھی آگئی کہ ہندی فوجیں حیدر آباد میں داخل ہوگئیں۔

یہ خبریں ان کے لیے صدمے سے کم نہیں تھیں لیکن اب تو وہ جیسے ہر صدمے کے عادی ہوگئے تھے۔ یہ صدمہ بھی بہت سے صدموں میں گھل مل گیا۔

وہ آخری کوشش کے طور پر ۳ اکتوبر ۱۹۴۸ء کو دہلی گئے۔

پانچ اکتوبر کو وہ ابوالکلام آزاد سے ملنے ان کی قیام گاہ پر گئے۔ بڑے تپاک سے ملے لیکن بشرے سے ظاہر ہوتا تھا کہ کچھ فکرمند ہیں یا انہیں توقع نہیں تھی کہ عبدالحق ان سے ملنے آسکتے ہیں۔ ان کی مشہورِ زمانہ لب سوز چائے آگئی۔

”جی مولوی صاحب، کیسی گزر رہی ہے۔ پاکستان میں۔“

”جس کی ایک اولاد یہاں اور ایک وہاں ہو۔ اس کا دل ایک جگہ کیسے لگ سکتا ہے؟“

”دل تو لگانا پڑے گا“ ابوالکلام آزاد نے کہا ”یہ ٹھیک نہیں ہے کہ آپ کی ایک ٹانگ یہاں ہے اور ایک وہاں۔“

”میں دونوں جگہ کام کرنا چاہتا ہوں بلکہ اس سے بھی آگے افغانستان، ایران، چین، عرب اور انڈونیشیا وغیرہ میں۔“

”اور ملکوں کا تو میں کہہ نہیں سکتا لیکن یہاں آپ کے بارے میں بہت سی بدگمانیاں ہیں۔ یہاں آپ کا رہنا دوبھر ہوجائے گا۔“

”ان بدگمانیوں کو دور کرنے کی یہی ایک صورت ہے کہ زبان اور کلچر جو پاکستان اور بھارت کی اکثر آبادی میں مشترک ہے، اس کے لیے پوری آزادی ہو خاص طور پر اردو کے لیے جو یہاں کے کروڑوں انسانوں کی زبان ہے۔“

”آپ کے کہہ دینے اور میرے مان لینے سے کوئی فائدہ نہیں۔ آپ خود ہی دیکھ چکے ہوں گے کہ انجمن کے لیے کوئی مکان تک دینے کو تیار نہیں۔ لوگ کانوں پر ہاتھ دھرتے ہیں۔ حکومت کے نزدیک آپ ایک مشکوک آدمی ہیں۔“

غرض کچھ ایسی باتیں ہوئیں کہ وہ ان کی طرف سے مایوس ہوکر اٹھ کھڑے ہوئے۔

اب انہیں بعض دوسرے دوست یاد آئے جو ان کے قدرداں بھی تھے۔ ان کے ہم نوا بھی اور بااثر بھی تھے۔ وہ ڈاکٹر تارا چند سے ملے، ڈاکٹر ذاکر حسین سے ملاقات کی۔ سب نے انہیں یہی مشورہ دیا کہ مستقل طور پر پاکستان چلے جائیں۔

ان کی یہ کوششیں حکومت کی نظروں سے پوشیدہ نہیں تھیں۔ خفیہ پولیس ان کی باقاعدہ نگرانی کر رہی تھی۔

ایک روز ایک باریش بزرگ ان سے ملنے آئے۔ نہایت دُکھے دل سے ہندوستان میں اردو کی حالتِ زار کا تذکرہ کیا۔ پھر پاکستان میں اردو کی بابت پوچھا۔ مولوی عبدالحق کا ہر وہ شخص دوست بن جاتا تھا جو اردو کا دوست ہو۔ یہ صاحب بھی مستقل آنے لگے۔ کرید کرید کر مولوی صاحب کے عزائم دریافت کرتے۔ اب ان سے کون ملنے کے لیے آنے والا ہے۔ اب وہ کس سے ملنے جا رہے ہیں۔ اگر وہاں سے یہ جواب ملا تو وہ کیا کریں گے؟ اگر وہ جواب ملا تو ان کا طرزِ عمل کیا ہوگا۔ مولوی صاحب اپنی سادگی میں سب کچھ بتاتے رہے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ سی آئی ڈی کا آدمی تھا۔

بابائے اردو کو یقین تھا کہ حکومتِ ہندوستان اگر تعاون کرے تو وہ دہلی میں رہ کر بھی کام کر سکیں گے۔ وہ اب تک یہی سمجھ رہے تھے کہ چونکہ اردو، ہندو اور مسلمانوں دونوں کی مشترکہ زبان اور قومی اثاثہ ہے اس لیے دہلی میں بیٹھ کر کام کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں لیکن حکومتِ ہند انہیں کسی قیمت پر برداشت کرنے کو تیار نہیں ہو رہی تھی۔ انہیں مجبور کیا جا رہا تھا کہ وہ انجمن سمیت اپنا بوریا بستر سنبھالیں اور پاکستان کی راہ لیں۔

انہیں اس مرتبہ کے دہلی کے قیام میں طرح طرح سے تنگ کیا جا رہا تھا۔ انہیں یہ محسوس ہونے لگا تھا جیسے وہ کسی دشمن ملک کے جاسوس ہوں۔

کہیں نجات کی کوئی صورت نہیں تھی۔ جن پہ تکیہ تھا جب وہ پتے بھی ہوا دینے لگے تو وہ ایک مرتبہ پھر ابوالکلام آزاد سے ملے۔

"میں انجمن کو کراچی لے جانے پر مجبور ہوں۔ بشرطیکہ کتب خانہ لے جانے کے ساتھ ساتھ مجھے وہ رقم بھی لوٹا دی جائے جو انجمن نے حکومتِ ہند کو زمین کی قیمت میں ادا کی تھی۔"

ابوالکلام نے یقین دہانی کرائی لیکن اس کے برعکس ہوا یہ کہ انجمن کا دفتر سربہ مُہر کر دیا گیا اور رقم لوٹا دینے کا وعدہ بھی وعدۂ معشوق ہو گیا۔

وہ بے یار و مددگار دلی میں پڑا رہا کہ اپنا دفتر واگزار کرا لے۔ ہر کوشش بے سود، ہر تدبیر بے کار گئی بلکہ اب تو انہیں یہ خدشہ ہونے لگا کہ کہیں اور کوئی الزام نہ لگ جائے۔ وہ تنگ آ کر بھوپال چلے گئے۔ وہاں بھی تقریباً ایک ماہ گزار دیا اور بالآخر ناکام و نامراد ۲۴ جنوری کو بمبئی پہنچ گئے۔ کچھ کام تھے، وہ نمٹائے اور ۲۸ دسمبر کو بمبئی سے کراچی کے لیے جہاز میں سوار ہو گئے۔

رخصت اے ہندوستاں، اے بوستانِ بے خزاں
رہ چکے تیرے بہت دن ہم بدیسی مہماں

○☆○

ہندوستان میں رہ کر جتنا کام کیا تھا، ساری محنت اکارت گئی۔ کتب خانے کی ضبطی کا داغ الگ دل پر لگا پھر بھی دل کو یہ تسلی تھی کہ اپنوں میں آ گئے۔ یہاں اردو کے لیے جھگڑنا نہیں پڑے گا۔ یہاں کی زبان اردو ہوگی۔ انہیں ہر مشورے میں شریک کیا جائے گا، ان کی قدر و منزلت ہوگی۔

نئے سرے سے کام کا آغاز کرنا تھا لیکن سرمائے کی شدید کمی تھی۔ حکومتِ ہند نے انجمن کے سرمائے منجمد کر دیے تھے۔

بہت بھاگ دوڑ کرنے کے بعد وہ کچھ سرمایہ اکٹھا کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ بیس ہزار حکومت پاکستان نے پچیس ہزار سالانہ ریاست خیرپور سے، پانچ ہزار کا عطیہ حکومت پنجاب نے اپنے بجٹ سے پچاس ہزار روپے انجمن کو دیے اور کام چل پڑا۔

انجمن کے ترجمان "قومی زبان، معاشیات، سائنس" وغیرہ کا اجرا ہوا۔ مطبوعات کا سلسلہ از سرِ نو شروع ہوا۔ دس ہزار کتابوں کے ذخیرے سے لائبریری کھولی گئی۔

ان کا اب بھی یہی ایمان تھا کہ مسلمانوں کی ترقی کا دارومدار اردو کی ترقی پر ہے۔ وہ جلد سے جلد پاکستان میں اردو کو انگریزی کا مقام دلوانا چاہتے تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ عدالتوں کی زبان اردو ہو، اسمبلیوں کی زبان اردو ہو، دفتروں کی زبان اردو ہو۔ اسکولوں اور کالجوں میں ذریعۂ تعلیم اردو ہو تاکہ ایسے نوجوان تیار ہوں جو انگریزی کے محتاج نہ ہوتے ہوئے ملک کی باگ ڈور سنبھال سکیں۔ اس کے لیے انہوں نے اردو کالج کھولا جس میں یونیورسٹی کے مضامین کی تعلیم اردو کے ذریعے دینے کا انتظام کیا گیا تھا۔

جامعہ عثمانیہ کا تجربہ ان کے سامنے تھا۔ اسی طرز کی یونیورسٹی وہ کراچی میں قائم کرنا چاہتے تھے جس کا پہلا زینہ یہ کالج تھا۔

اس کالج کے کھلنے کے بعد پہلی مرتبہ انہیں احساس ہوا کہ یہاں نہ کوئی خود کام کرنا چاہتا ہے نہ دوسرے کو کام کرتے ہوئے دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔ یہ احساس اس وقت ہوا جب اس کالج کے الحاق کا مسئلہ آیا۔

کوئی یونیورسٹی اس کے الحاق کے لیے آمادہ نہیں تھی۔ بڑی مشکل میں جان تھی۔ وہ تو سمجھ رہے تھے، حکومتی حلقوں میں ان کے اس کام کی بڑی پذیرائی ہوگی لیکن یہاں کا تو عالم ہی دوسرا تھا۔ محکمۂ تعلیم کے دفاتر کے چکر وہ اس طرح کاٹ رہا تھا جیسے کوئی اسے یہاں جانتا ہی نہ ہو۔ اس کا ماضی اور حال کسی کے سامنے ہی نہ ہو۔ سندھ یونیورسٹی نے نہ جانے کن مصالح کی بنا پر انکار کردیا۔ ایک طویل خط وکتابت کے بعد انکار ہوگیا۔ اب انہوں نے پنجاب یونیورسٹی سے خط و کتابت شروع کی۔ ان کا جواب یہ آیا کہ یہ کالج پنجاب یونیورسٹی کی حدود ارضی سے باہر ہے اس لیے الحاق ممکن نہیں۔

بہت ممکن تھا کہ وہ مایوس ہوکر اس منصوبے سے ہاتھ اٹھالیتے لیکن مایوس ہونا تو انہوں نے سیکھا ہی نہیں تھا۔ ایک مرتبہ پھر کوششوں میں جُت گئے۔ آخر ایک طویل تگ ودو کے بعد وزیر خزانہ غلام محمد اور وزیر تعلیم فضل الرحمٰن کی مدد سے سندھ یونیورسٹی نے الحاق منظور کرلیا۔

انجمن کے پہلے صدر سر شیخ عبدالقادر تھے۔ ان کے انتقال کے بعد (۱۹۵۰ء) عبدالحق صدر رہے۔

پاکستان کے شب و روز سیاسی کمزوریوں میں بسر ہو رہے تھے۔ ہندوستان میں اردو، ہندی تنازع روبرو تھا۔ اب قومی زبان کا مسئلہ کھڑا ہوا تھا۔ ہرچند کہ بابائے قوم حضرت قائداعظم نے صاف لفظوں میں کہہ دیا تھا۔

"اگر تم پاکستان کو قائم رکھنا چاہتے ہو تو یاد رکھو کہ پاکستان کی زبان صرف اردو ہوسکتی ہے۔ کوئی اور زبان نہیں۔"

اس فرمان کے باوجود بنگالیوں نے بنگالی کے حق میں آواز بلند کی۔ بدقسمتی سے یہ مسئلہ جو خالص لسانی اور ثقافتی تھا، سیاسی گتھیوں میں الجھادیا گیا۔

اب مولوی عبدالحق کا سب سے بڑا مشن اردو کو پاکستان کی قومی اور سرکاری زبان کا درجہ دلانا تھا۔ اس کا ثبوت وہ اردو کالج قائم کرکے دے چکے تھے کہ اردو میں ذریعۂ تعلیم بننے کی پوری صلاحیت ہے لیکن اہلِ اقتدار انگریزی سے گلوخلاصی کے لیے تیار نہیں تھے۔

انہوں نے اکابرین کی توجہ اس طرف دلانے کے لیے کراچی میں ایک اردو کانفرنس بلائی۔ اس کی صدارت عبدالرب نشتر نے کی۔ گورنر جنرل ناظم الدین نے اپنے خطبے میں مشرقی پاکستان میں اردو کی ترویج کے لیے تجاویز پیش کیں۔

اس کانفرنس میں عبدالحق نے جن خیالات کا اظہار کیا ان سے ان کے عزائم کا پتا چلتا تھا کہ وہ جھکے نہیں ہیں۔ اس معاملے میں کتنے آگے جاسکتے ہیں۔

"کسی تحریک کو ہمدردوں کی ہمدردی اور مربیوں کی سرپرستی سے تقویت نہیں پہنچتی بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس تقویت کا راز بہت کچھ مخالفت میں ہے۔ مخالفت بیدار کرتی ہے۔ عملی قوت کو ابھارتی ہے۔ انسان کے ان جوہروں کو جلادیتی ہے جو پہلے مدھم پڑے تھے۔ مخالفت درپردہ امتحان ہے۔ تحریک اگر حق پر ہے اور کام کرنے والوں میں خلوص اور استقلال ہے تو مخالفت دب جائے گی۔ اور تحریک سوبسوے کامیاب ہوگی۔ مخالفت نے پاکستان بنادیا ورنہ کیا اتنی جلد بن جاتا اور مخالفت کے طفیل ہی اردو کو ترقی نصیب ہوئی۔"

انہوں نے مخالفت طلب کی تھی۔ مخالفت ملی اور خوب ملی۔

اس کے بعد سے وہ مسلسل اردو کا مقدمہ لڑتے رہے۔ ہندوستان میں اگر غیروں کا سامنا تھا تو یہاں اپنوں سے سابقہ پڑا جو زیادہ تکلیف دہ تھا۔ انہیں دکھ تھا تو یہ کہ یہاں بھی اردو کی اہمیت بتانی پڑرہی ہے۔

"قومیت کے لیے یک رنگی کے لیے ہم خیالی کی اور ہم خیالی کے لیے ہم لسانی کی سخت ضرورت ہے جہاں زبان ایک نہیں وہاں خیال کا رنگ ایک نہیں۔ جہاں خیال ایک نہیں وہاں دل بھی ایک نہیں۔"

انہوں نے کبھی کی کہی ہوئی باتوں کو دہرانا شروع کیا کہ وہی مسئلے اب یہاں بھی درپیش تھے۔ کہی ہوئی باتوں کو دوبارہ کہنے میں کیسی بے دلی ہوتی ہے یہ وہی سمجھ سکتے ہیں جو اس مرحلے سے گزرے ہیں لیکن وہ اس بے دلی میں بھی حوصلے اور عزم کا چمن کھلائے بیٹھے تھے۔ کبھی کنونشن بلاتے کبھی کانفرنس منعقد کرتے۔ کبھی سرکاری افسروں سے ملتے۔ ہر تقریر، ہر تحریر میں یہی کہتے رہے کہ اردو کو سرکاری زبان بناؤ۔

جب کوئی بات سننے کو تیار نہیں تھا تو کام کون کرتا۔ مالی امداد کی سخت ضرورت تھی لیکن ذرائع محدود سے محدود تر۔

ایک دن عجیب اتفاق ہوا۔ شام کی سیر ان کا معمول تھی۔ ایک دن وہ ٹہلنے کے لیے نکلے۔ سڑک کے کنارے کنارے پیدل چل رہے تھے۔ ادھر سے گورنر جنرل غلام محمد کی سواری آگے پیچھے جیپوں کے درمیان سڑک سے نکلی اور یکایک رک گئی۔ گورنر جنرل کار سے اترے اور ان کے پاس

آ گئے۔

''آیئے'' انہوں نے مولوی عبدالحق کا ہاتھ پکڑا اور انہیں لے کر اپنی کار میں آ گئے۔

انہوں نے راستے میں خود ہی انجمن کا ذکر چھیڑا۔ عبدالحق نے اپنی مشکلات سے انہیں آگاہ کیا اور اس حقیقت کے قائل ہوئے کہ اردو کے بڑے بڑے کام بغیر حکومت کی امداد کے نہیں ہوسکتے۔ انہوں نے یہ وعدہ بھی کیا کہ وہ وزیرِ تعلیم فضل الرحمٰن کو بلا کر اس کے متعلق کچھ کہیں گے۔

غلام محمد نے اپنے وعدے کا اتنا پاس تو کیا کہ فضل الرحمٰن سے بات کی اور ان کی سفارش پر حکومت پاکستان نے 'پانچ سو روپے ماہانہ کی پنشن منظور کی اور لکھا کہ یہ پنشن اردو کی لائقِ توصیف' خدمت کے سلسلے میں بابائے اردو مولوی عبدالحق کو دی جاتی ہے۔

وہ یہ پنشن لینے کو تیار نہیں تھے۔ وہ یہاں پاکستان کی خدمت کرنے کے لیے آئے تھے اس لیے نہیں آئے تھے کہ پاکستان پر بار بنیں لیکن بار بار کے تقاضوں کے بعد انہوں نے یہ کیا کہ اپنی اس ذاتی پنشن کو انجمن کے نام منتقل کر دیا۔

''حکومت نے جو پنشن میرے لیے عطا فرمائی تھی وہ میں نے انجمن کو منتقل کر دی۔ میں یا مجھ جیسے دوسرے افراد رہیں نہ رہیں' انجمن کا رہنا لازمی ہے۔ میں نے حقہ چائے وغیرہ ترک کر دیے ہیں۔ اپنی ضرورتیں بہت کم کر دی ہیں۔ کھانے کے لیے میں ۶۳ روپے ماہانہ رکھے ہوئے ہیں۔ چند روپے دھوبی حجام کے سمجھ لیجئے کپڑوں کی ضرورت ہے نہ جوتوں کی البتہ دو تین طالب علموں کو مدد دیتا ہوں' دیتا رہوں گا۔''

(خط بنام عبادت بریلوی)

اس طرح کوئی انجمنیں چلتی ہیں۔ وہ اپنی ضرورتوں میں کٹوتی کرکے بھی کتنا بچا سکتے تھے۔ ان کے پاس علم و ادب اصطلاحات و لغات کا ڈھیر رکھا تھا لیکن اشاعت کے لیے روپیا نہیں تھا۔ انہوں نے حکومت سے کچھ رقمی امداد طلب کی تاکہ تمام دفاتر اور عدالتی الفاظ و اصطلاحات کی ڈکشنری تیار ہوسکے لیکن اہلِ اقتدار کو اردو رائج ہی نہیں کرنی تھی تو ان اصطلاحات کی پروا کیوں ہوتی۔

۱۹۵۴ء میں ایک مرتبہ پھر انہیں اپنی محنت اکارت جاتی ہوئی نظر آئی۔ بابائے قوم کے فرمان کے برعکس یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ ایک ملک میں دو قومی زبانیں ہوں گی۔

جس روز مجلس دستور ساز میں زبان کا مسئلہ پیش ہونے والا تھا' وہ انجمن کے دفتر سے پیدل روانہ ہوئے' ایک لاکھ کا مجمع ساتھ تھا۔ مئی کی گرمی میں تین میل کا فاصلہ طے کرکے یہ جلوس اس مقام تک پہنچ گیا جہاں بلا اجازت داخل ہونا ممنوع ہے۔ پولیس اور مسلح فوج مشین گنیں اور ٹینک لیے کھڑی تھی۔ سارے شہر میں کامل ہڑتال تھی۔ لوگوں میں سخت اشتعال پھیلا ہوا تھا۔ یہ سب مولوی عبدالحق کی تحریری کاوشوں کا نتیجہ تھا کہ عوام کو اسمبلی میں پیش ہونے والے دولسانی بل کے بارے میں معلوم ہوسکا اور وہ بابائے اردو کی سربراہی میں اپنے گھروں سے اسمبلی تک آ گئے۔

ہزاروں افراد ممنوعہ علاقے میں زبردستی داخل ہو گئے۔ اب اس میں کوئی شک نہیں رہ گیا تھا کہ نہایت خون خرابہ ہوگا لیکن محمد علی بوگرہ کی دانش مندی یا سیاسی چال نے اس خطرے کو ٹال دیا۔ وہ اسمبلی سے باہر آ کر مولوی صاحب سے ملے۔

''آپ ان سب لوگوں کو لے کر کیوں آئے ہیں؟''

''انہیں میں نہیں لایا' اردو کی محبت انہیں لے کر آئی ہے۔ حکومت کے ایک غلط فیصلے سے اختلاف انہیں یہاں لے کر آیا ہے۔ اب آپ کو ہوا کا رخ پہچان لینا چاہیے۔ اس ملک میں صرف اردو کو قومی زبان کا درجہ ملنا چاہیے۔''

''یہ ایک سنجیدہ مسئلہ ہے جو گفت و شنید سے طے ہوسکتا ہے' احتجاج سے نہیں۔''

''کاش! یہ بات آپ پہلے سوچ لیتے۔ آپ نے تو اجلاس بلا لیا۔''

''دیکھئے تو اجلاس میں کیا طے ہوتا ہے۔ کیا خبر یہ بل پاس ہی نہ ہوسکے۔''

''اور اگر پاس ہو گیا؟''

''پھر ہمیں اور آپ کو اسمبلی کی رائے کا احترام کرنا ہوگا۔''

''ایسا بل پیش ہی کیوں کیا جائے' پہلے معاملہ صاف ہونا چاہیے۔''

ماخذات: بابائے اردو' ڈاکٹر معراج نیر۔

ذکرِ عبدالحق' سید معین الرحمٰن

نقدِ عبدالحق

نقوش

نایاب ہیں ہم' حمیدہ اختر۔

"آپ ان لوگوں سے کہئے کہ پُرامن طور پر اپنے گھروں کو چلے جائیں۔"
"کس ضمانت پر؟"
"ہم آپ سے مذاکرات کرنے کو تیار ہیں۔"
"تو پھر آج کا اسمبلی کا اجلاس برخاست کیجئے۔"
محمد علی بوگرہ اب بے بس ہوگئے۔ انہوں نے اجلاس ملتوی کرنے کا وعدہ کرلیا اور دوسرا دن عبدالحق سے گفتگو کرنے کا ٹھہرا۔
بابائے اردو نے اسی وقت مجمع کو اس فیصلے سے آگاہ کیا اور مجمع پُرامن طور پر منتشر ہوگیا۔
دوسرے دن وعدے کے مطابق گفتگو بھی ہوئی۔ معاہدہ بھی لیکن عمل اس کے خلاف ہوا۔

○☆○

بہت دنوں سے ان کا ایک خواب تھا اور وہ یہ کہ جس طرح دنیا کی بڑی زبانوں میں یہ دستور ہے کہ ہر موضوع پر لکھی جانے والی مطبوعہ و غیر مطبوعہ کتابوں کی فہرست کتابی شکل میں شائع کی جاتی ہے، اسی طرح اردو کی کتابوں کی بھی ایک جامع فہرست ہونی چاہیے۔ ریسرچ کرنے والوں کو مختلف لائبریریوں کی خاک چھاننے کے بجائے محض "قاموس الکتب" کی ورق گردانی سے معلوم ہوجائے گا کہ فلاں موضوع پر کتنی کتابیں کس کس مصنف کی موجود ہیں۔
اردو جیسی بڑی زبان میں جس میں ہر موضوع پر ہزاروں کتابیں لکھی گئی ہوں، ایسی فہرست کی تیاری آسان بات نہیں۔ اس کے لیے بڑے وسائل کی ضرورت ہے۔
عبدالحق نے اس منصوبے سے حکومت کو آگاہ کیا۔ وزارت تعلیم نے اس طرف کوئی توجہ نہیں کی۔ وہ پھر دل مسوس کر رہ گئے۔ البتہ انجمن میں اس فہرست کا کام چلتا ضرور رہا۔
انہی دنوں (۱۹۵۶ء) یونیسکو نے حکومت سے دریافت کیا کہ آپ کے پاس اپنی زبان کی کوئی ببلوگرافی ہے؟ اگر نہیں ہے تو کیا تیار ہوسکتی ہے؟
اب وزارتِ تعلیم کو ان کی یاد آئی۔ وہی منصوبہ جو انہوں نے پیش کیا تھا، اب بیش قیمت نظر آنے لگا۔
"ہمارے تعلیم یافتہ لوگ عربی فارسی کتابوں کو مطلق قابلِ التفات نہیں سمجھتے۔ ہاں، اگر کوئی یورپین یا امریکی کسی کتاب یا ہمارے کسی قدیم نظریئے کے متعلق کوئی تعریفی کلمہ کہہ دے تو وہ ان کے لیے وحی والہام ہوجاتا ہے۔"
اب وزارت تعلیم والے بھاگے ہوئے آئے۔ امداد دینے پر تیار ہوگئے اور رقم دے دی۔
ان ناقدریوں میں گھرا ہوا آدمی، اپنے مقاصد کے سامنے چٹان کی طرح کھڑا ہوا تھا، البتہ ان تجربوں نے اسے تلخ اور غصیلا ضرور کردیا تھا۔ بات بات پر بھڑک جانا ان کا مزاج بن گیا تھا۔ ان کے احباب اور ساتھ کام کرنے والے رفیق ان کے مزاج کو سمجھتے تھے اس لیے تمام کام خوش اسلوبی سے چل رہے تھے۔
انہوں نے اس خیال سے کہ روز مرہ کے انتظامی جھگڑوں، حسابات اور پریس وغیرہ کی نگرانی سے نجات مل جائے اور وہ اپنی توجہ صرف ادبی کاموں کی طرف مبذول کرسکیں، جدید سیکریٹری، جوائنٹ سیکریٹری کا انتخاب کرایا۔ نئے خازن کا بھی انتخاب ہوا۔
وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ اب کام اطمینان سے چلے گا مگر معاملہ برعکس نکلا۔ ان نئے آنے والوں نے غلط پروپیگنڈا اور سازش سے مجلس منتظمہ میں اپنی اکثریت بنالی اور تخریبی کارروائیاں شروع کردیں۔ الٹی سیدھی جو چاہتے، کرتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حالات ابتر ہوگئے۔ انجمن پانچ رسالے نکالتی تھی ان میں سے تین رسالے بند ہوگئے۔ مالی حالت اس حد تک ابتر ہوگئی کہ ملازمین کی تنخواہیں تک ادا کرنی مشکل ہوگئیں۔ انجمن چالیس ہزار کی مقروض ہوگئی۔
ادھر یہ بحرانی اور ادھر مجلس ناظمین اور عبدالحق کے درمیان اتنے اختلاف بڑھے کہ معاملہ الزام تراشیوں تک پہنچ گیا۔ انجمن کے وہ کارکن جن سے مولوی صاحب کو بڑی امیدیں تھیں، ان کے خلاف سازشوں میں شریک ہوگئے۔ ان کے خلاف پوسٹر چسپاں ہونے لگے، رکیک الزامات شائع ہونے لگے۔
ان کے قدیم ساتھی اور رفیق ایک ایک کرکے رخصت ہوگئے اور وہ اکیلے ان کا ماتم کرنے اور پاکستان میں ٹھوکریں کھانے کے لیے رہ گئے۔
یہ ان کے لیے بڑی آزمائش کا دور تھا۔ ایک وقت وہ تھا کہ وہ گاندھی سے ٹکرا گئے تھے لیکن اب چھیاسی سال کی عمر میں وہ ایسے قضیوں کا بار اٹھانے کے لائق نہیں رہے تھے۔ ان کے حریف تازہ دم تھے اور بہت تھے۔ ان کے دماغ تخریبی جدتوں سے مالا مال۔ وہ بے دست وپا ہوکر رہ گئے۔ انجمن ان لوگوں کے تصرف میں آگئی جو حقیقی معنوں میں مولوی صاحب کے رفیق ومددگار نہیں تھے۔
مولوی صاحب کو یہاں تک اذیت پہنچائی گئی کہ ان پر کتب خانے کے دروازے بند کردیے۔ وہ تیسری منزل پر

قیدیوں کی سی زندگی گزارنے پر مجبور تھے۔ بیمار تھے' بوڑھے تھے اردو کے محسن تھے لیکن سازشیں یہ کب دیکھتی ہیں۔

اس دور کے بابائے اردو کو دیکھ کر اکثر لوگ کہتے تھے' سرسید کے آخری ایام کی تاریخ دہرائی جارہی ہے۔

○☆○

وہ لڑکی جسے وہ بڑے چاؤ سے کبھی اختر حسین رائے پوری کی دلہن بنا کر حیدر آباد لائے تھے اور اس کے آجانے سے نادر منزل میں خوشیاں اتر آئی تھیں' ان سے ملنے آئی۔

اس لڑکی نے اس شیر جیسے انسان کو بے بسی کے ساتھ سر جھکائے بیٹھے دیکھا تو اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

"بس آپ میرے ساتھ چلیں۔"

"بھلا میں کہاں جا سکتا ہوں۔ میں تو ایک قیدی ہوں۔ پھر اگر انجمن کو چھوڑ کر جاؤں تو جو میری نادر کتابیں اور قلمی نسخے باقی رہ گئے ہیں' وہ بھی شاید نہ رہیں۔"

وہ لڑکی سوچ میں پڑ گئی کہ یہ عظیم انسان' محسنِ قوم و زبانِ اردو کسی کے قیدی ہو سکتے ہیں؟ ان کے چہرے پر تو میں نے ہمیشہ ہنسی دیکھی تھی۔

یہ والا چہرہ اور یہ دھندلی اور پپوٹے پھولی آنکھیں تو میرے تصور میں بھی نہیں تھیں۔

اس لڑکی نے انہیں ہنسانے کے لیے حیدر آباد کی باتیں چھیڑدیں جب وہ بیاہ کر آئی تھی اور مولوی صاحب اس کے لیے شفقت کا پیکر بن گئے تھے۔

جب وہ لڑکی چائے پی چکی تو مولوی صاحب نے کہا "اب جاؤ۔"

وہ لڑکی یہ سوچتی ہوئی ان کے کمرے سے نیچے اترنے والی سیڑھیاں اتر کر نیچے آگئی کہ آخر وہ کون لوگ ہیں جنہوں نے ایسے عظیم اور قوم کے محسن کو قیدی ہونے کا احساس دلایا ہوا ہے۔

○☆○

جس انجمن کو وہ دنیا کی نظر بچا کر لائے تھے اپنے ہی وطن میں تماشا بنی ہوئی تھی۔

ایک بھی ڈھنگ کا رفیق اس وقت ان کے ساتھ نہیں تھا جو حریفوں کو جواب دیتا جبکہ حریفوں میں کئی بڑے زوروں کے آدمی تھے۔ انہوں نے بعض سرکاری عمال کو بھی اپنے ساتھ ملایا ہوا تھا۔

ابنِ انشا اس صورتِ حال سے پوری طرح باخبر تھے اور اس محاذ پر انہوں نے اپنی ہمت سے بڑھ کر مولوی صاحب کا ساتھ دیا بھی لیکن جب حریفوں نے ان کی خبر لینی شروع کردی تو وہ اپنی سرکاری ملازمت بچانے کے لیے اس سے الگ ہوگئے لیکن اس کا دکھ انہیں ہمیشہ رہا۔

"حریفوں نے ہمارے مولوی صاحب کو اتنی اذیت دی ہے کہ اگر دس سال جینا تھا تو دو سال جئیں گے غضب خدا کا انہیں لائبریری تک سے نکال رکھا ہے۔ مولوی صاحب کی طبیعت میں اگر کوئی نقص کی بات ہے بھی تب بھی ان کی خدمات' عمر اور عظمت کو دیکھتے ہوئے ایسا کرنا سخت زیادتی ہے۔"

(خط بنام خلیل الرحمٰن اعظمی)

یہ قضیہ شاید یوں ہی چلتا رہتا اور مولوی صاحب کی عمر تمام ہو جاتی کہ ملک میں جنرل ایوب خاں کا مارشل لا آگیا۔

قدرت اللہ شہاب ایوانِ صدر میں تعینات تھے۔ گلڈ وغیرہ کے سلسلے میں ابنِ انشا کی ملاقات جمیل الدین عالی کے توسط سے قدرت اللہ شہاب سے ہوئی۔

ملک میں مارشل لا تھا۔ مختلف اداروں کی چھان بین ہو رہی تھی۔ موقع غنیمت دیکھ کر ابنِ انشا نے قدرت اللہ شہاب کی توجہ انجمن کے معاملات اور بابائے اردو کی حالت کی طرف دلائی۔ ان کی کوششوں سے وفاقی وزارتِ تعلیم نے انجمن کے معاملے پر انکوائری کمیٹی بٹھا دی۔

صدر ایوب کی ذاتی توجہ بھی اس طرف مبذول کرائی گئی۔ تمام حالات ان کے گوش گزار ہوئے۔ وہ خود بابائے اردو سے ملنے آئے۔ تمام روداد ان کی زبانی سنی۔

"مولوی صاحب تو اردو کے قائداعظم ہوئے نا؟"

یہ ایسا تاریخی جملہ تھا کہ مولوی صاحب کے تمام آنسوؤں کی قیمت ادا ہو گئی۔

انجمن کے پرانے اراکینِ منتظمہ میں سے بیشتر انتقال

قطعہ تاریخِ وفات

جدا ہم سے بابائے اُردو ہوئے
ہم اب فیض سے ان کے محروم ہیں
انہوں نے جو اُردو کی خدمتیں
وہ سب قوم کے دل پر مرقوم ہیں
یہ اللہ کے فضل سے ہے اُمید
کہ باغِ جناں میں وہ مخدوم ہیں
لکھا قادری نے یہ سالِ وفات
کہ تھے خادمِ قوم' مخدوم ہیں

۱۹۶۱ء

کرچکے تھے۔ چند بوڑھے اور غیر فعال' ایک دو' مولوی صاحب سے شدید اختلاف کے حامل چنانچہ صدر ایوب نے وہ پرانی برائے نام منتظمہ توڑ دی اور ایک دستوری کمیٹی بنا کر مولوی صاحب کو صدر و نگراں نامزد کردیا۔

مولوی صاحب کو ان کی انجمن واپس مل گئی۔ دوستوں نے مبارک بادیں دیں لیکن اب تو وہ اس کشتی کی طرح تھے جسے سنبھلنے کی خوشی بھی نہیں تھی۔

اسی سال انہیں نشانِ قائداعظم اور دس ہزار روپے نقد ملے جو انہوں نے انجمن کے فنڈ میں جمع کرادیے۔

حکومت نے اردو ترقی بورڈ قائم کیا اور لغت کی ترتیب کے لیے ان سے درخواست کی۔ لغت سازی تو ان کا برسوں کا خواب تھا لہٰذا بخوشی اس کام کو اپنے ذمّے لے لیا۔ یہ بھی اجازت ملی کہ اپنی پسند کے مددگار وغیرہ انتخاب کرلوں۔

اللہ نے ان کو ان کے صبر کا پھل نہایت شیریں عطا کیا اور وہ جی جان سے لغت سازی میں مشغول ہوگئے۔

○☆○

ایک خواب اور تھا جو انہیں رہ رہ کر یاد آتا تھا۔ یہ خواب تھا "اردو یونیورسٹی۔"

عثمانیہ یونیورسٹی کے قیام کے بعد انہیں پورا یقین تھا کہ شمالی ہندوستان میں یہ یونیورسٹی قائم ہوکر رہے گی لیکن ہندوستان کے بدلتے ہوئے سیاسی حالات نے اس خواب کو شرمندۂ تعبیر نہ ہونے دیا۔ نوبت تقسیم ملک تک پہنچ گئی۔ بہت سوں کے بہت سے خواب پورے نہ ہوسکے تو یہ خواب کس گنتی میں تھا۔

پاکستان آنے کے بعد یہ قوی امید تھی کہ یہ تو اپنا ملک ہے۔ یہاں تو اسے عمل میں لانے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی لیکن یہاں تو ہوا ہی دوسری چلنے لگی۔ قائداعظم بہت جلدی اللہ کو پیارے ہوگئے۔ پھر اردو زبان کا طے شدہ مسئلہ ہی نزاعی مسئلہ بن گیا۔ ان کی ساری توانائیاں اس فتنۂ بیدار کو کسی نتیجے تک پہنچانے میں صرف ہونے لگیں۔ پھر خود انجمن کے اندرونی جھگڑوں نے انہیں ہلکان کردیا۔

وہ عمر کے آخری حصے میں بھی اپنی صحت سے بے پروا ہوکر اردو یونیورسٹی کے لیے عملی جدوجہد میں مصروف تھے لیکن حسبِ دل خواہ تعاون نصیب نہ ہوا۔

طلبہ کی ایک تنظیم "بزمِ افروز" کی افتتاحی تقریب میں وہ یہ کہنے پر مجبور ہوگئے۔

"لوگ مجھے بابائے اردو کہتے ہیں لیکن پاکستان میں آکر تو میں طفلِ اردو ہوں۔ وہ کام اب تم پورا کروگے جسے میں پورا نہ کرسکا۔"

یہ کہتے کہتے ان کی آواز رندھ گئی اور وہ بڑی مشکل سے اپنی تقریر جاری رکھ سکے۔

اس کے ایک سال بعد ۱۹۶۰ء میں اسی بزم کے طلبہ نے بابائے اردو کی اپیل پر یونیورسٹی فنڈ کے لیے ۲۷۰ روپے کا نذرانہ پیش کیا تو رقم لیتے ہوئے ان کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ پھر متعدد مقامات پر طلبہ نے اس فنڈ کے لیے رقم جمع کی اور بابائے اردو کے حضور پیش کی لیکن محض نذرانوں سے تو یونیورسٹیاں نہیں بنا کرتیں۔ صرف امیدوں سے تو چراغ روشن نہیں ہوا کرتے۔

وہ ہرچند یہ کہتے رہے کہ میں اب زندگی کی اس منزل میں ہوں جہاں کام سے زیادہ آرام کی ضرورت ہوتی ہے لیکن اردو یونیورسٹی کا قیام اب میری زندگی کا مشن ہے اور اس مشن کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے میں سب کچھ کرنے کو تیار ہوں چاہے مجھے اس سے کتنی ہی تکلیف پہنچے لیکن اب عمر کی نقدی ختم ہونے کو تھی۔ نوّے سال کی عمر ہوچکی تھی۔ بیماریاں ساتھ لگی ہوئی تھیں۔

اس مرتبہ ایسے بیمار ہوئے کہ سنبھلنے ہی میں نہیں آتے تھے۔ ان کے پاس اتنے پیسے بھی نہیں تھے کہ اپنا علاج کرا سکتے۔ ۵ مئی ۱۹۶۱ء کو جناح اسپتال میں داخل ہوگئے۔

قاموس الکتب کی پہلی جلد مکمل ہوگئی تھی۔ اس میں ۱۱۶۷ کتب کی فہرست تھی۔ اسی بیماری کی حالت میں بستر پر لیٹے لیٹے اس پر مقدمہ تحریر کیا۔

جب حالت نہ سنبھلی تو ایوب خاں نے کمبائنڈ ملٹری اسپتال میں علاج کی پیش کش کی۔ ۲۳ جون کو وہ پنڈی روانہ ہوگئے۔ دو ماہ کے مکمل علاج کے بعد ڈاکٹروں نے جگر کا سرطان بتایا۔

کراچی کے نیول اسپتال میں داخل کردیا گیا۔

۱۵ اگست ۱۹۶۱ء کو اچانک طبیعت بہت زیادہ بگڑ گئی۔

۱۶ اگست کو صبح آٹھ بج کر ۴۵ منٹ پر آخری ہچکی کے ساتھ ان کی زبان سے "انجمن" کا نام ادا ہوا اور ہمیشہ کے لیے آنکھیں بند کرلیں۔

انجمن ترقی اردو کے قدیم دفتر۔ شاردا مندر کی عمارت میں وہ آج بھی ابدی نیند سو رہے ہیں۔

زمانہ جب بھی لکھے گا زبان کی تاریخ
ترا خلوص ترا نام جگمگائے گا

■■■